سلمان باقر کے اِنشائیے

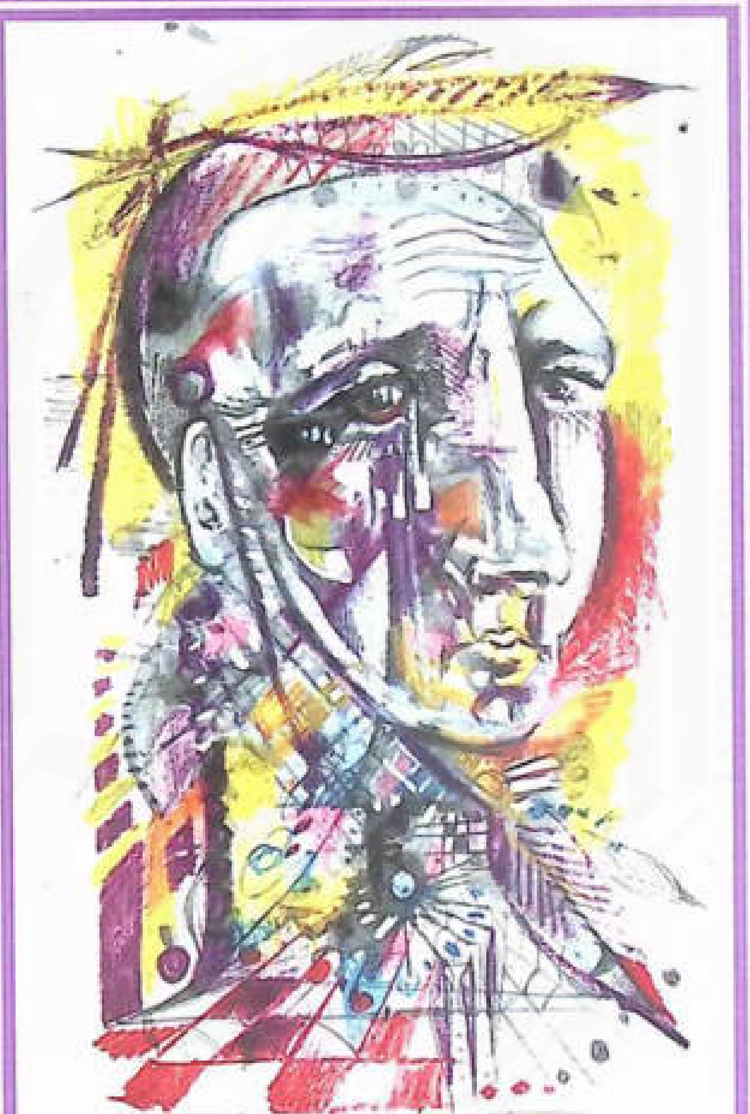

آغا سلمان باقر

سلمان باقر کے اِنشائیے

آغا سلمان باقر

آبِ حیات پبلیکیشنز، انارکلی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فروری ۲۰۱۷ء

FEB. 2017
Baqir, Agha Salman
Salman Baqir ke Inshaiye
176 Pages.
Aab-e-Hayat Publications, Lahore

سلمان باقر کے انشائیے ———
مصنف: آغا سلمان باقر
کمپوزنگ: کاشف رضا حسین
ٹائٹل: قیصر علی
پرنٹر: نواز پرنٹنگ پریس، 2 سوہنی روڈ، لاہور
پبلیشر: عمران الطاف
قیمت: -/400 روپے

Aab-e-Hayat Publications.
186-New Anarkali-Lahore

یکے از مطبوعات

آب حیات پبلیکیشنز، 186 ۔ نیو انارکلی، لاہور

فون نمبر: 042-37320114 — 042-37324311

انتساب

عہدِ جدید کے اُن تخلیق کاروں کے نام
جو جرأتِ رندانہ رکھتے ہیں .... !

اور

اِس مشکل وقت میں بھی
سچ بولنے سے باز نہیں آتے —— !

maablib.org

فہرست

صفحہ نمبر

آغا سلمان باقر — ایک زندہ و جاوید انشائیہ نگار — فرحت عباس شاہ	7
1۔ گدھا	9
2۔ مُنافع	15
3۔ انسپکٹر	21
4۔ موتیے کا پھول	28
5۔ ہم	35
6۔ مار نہیں پیار	42
7۔ فیری میڈ و کا خواب	48
8۔ سَر درد	57
9۔ غربت بہت ہے — !	65
10۔ خباثت	73
11۔ دستور	81
12۔ شکاری	91
13۔ لارنس کے میلے	102
14۔ ڈاکو	113
15۔ جھوٹ	126
16۔ بازارِ حُسن	138
17۔ بھولا اور بھولی	146
18۔ خط	154
19۔ نوکرانی	163

maablib.org

فرحت عباس شاہ

آغا سلمان باقر ـــــ ایک زندہ و جاوید انشائیہ نگار

میرا دعویٰ ہے کہ ابھی جھوٹ پوری طرح غالب نہیں آسکا کہ جب تک دنیا میں سلمان باقر جیسے خالص ادیب اور تخلیق کار موجود ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔ ایسے میں یہ تو ممکن ہی نہیں کہ سچائی کو مکمل طور پر مغلوب کر لیا جائے۔

انشائیہ، میرے خیال کے مطابق کسی عنوان کے گرد بے لگام گھومنے والی تحریر ہے، جو ایک لمحے کے لئے بھی قاری کا دھیان اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتی ہے۔

ہلکے پھلکے انداز میں معاشرتی ناانصافیوں کو تھپڑوں اور ٹھوکروں کے تسلسل پر رکھنا اور پھر ہر دوسرے جملے میں دانائی کی پوری پوری کتابیں سمیٹ دینے کو سلمان باقر کا انشائیہ کہتے ہیں۔

آج کل نثر کی اصناف تو کمزور پڑیں سو پڑیں، شاعری کا تو جیسے جنازہ ہی نکل گیا ہے۔ ہر شاعر اچھی سے اچھی لیکن ایک جیسی غزل کہہ رہا ہے اور خیر سے اتنا ویژن بھی نہیں رکھتا کہ شاعری دراصل، پختہ مصرعوں کی جمع تفریق اور چونکا دینے والی کرتب بازی کے علاوہ بھی کچھ ہے۔

سلمان باقر کے انشائیے پڑھتے ہوئے ہر سطر پر ایک بے ساختہ اور ہمکتی ہوئی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پہ آئی تو ساتھ ہی آنکھوں میں چھچھوڑا لنے والی، ہواسی نمی نے بھی پلکوں کو لرزا دیا۔

مجھے سلمان باقر کے انشائیے پڑھتے ہوئے ایسے لگا جیسے سلمان باقر نے شاعری، ناول، افسانہ اور تخلیقی کالم جیسی تمام اصناف کی رُوح کسی ماہر عامل کی طرح حاضر کر کے اپنے انشائیوں میں اُتار دی ہو ــــ !

ادیب کا کیا کام ہے ــــ ؟

اگر کسی کو پتہ ہے بھی تو وہ اُس پر دو حرف بھیج کر کالم نگار اور کالم نگار سے رقم نگار بن کر زندگی بسر کرنے کو کائنات کی آخری دانائی قرار دے چکا ہے ــــ ادیب کا کام وہ ذمہ داری ہے کہ جو سلمان باقر نے اپنے انشائیوں میں پوری کی ہے۔ وہ ایک ایسا درویش اور دیوانہ ہے جو دُکھ تو آج کے اُٹھا رہا ہے، لیکن دل صدیوں پرانی کسی معصومیت سے بھرا ہوا، لے کر پھرتا ہے ــــ !

سلمان باقر حکمت کی تمام مُوشگافیوں سے آگاہ، نقصان کے سَودے کرتا پھر رہا ہے، کیوں کہ اُسے علم ہے کہ دل، احساس، جذبہ، سچائی، روحانیت اور شعور، منافع سے نہیں بلکہ خسارے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں ــــ !!!

فرحت عباس شاہ

۱۸۔ جون ۲۰۱۶ء

گدھا

یقین مانیے کہ گدھا ایک نہایت عقل مند اور ہوش مند جانور ہے۔ اس لئے کہ اپنے ذاتی معاملات میں گدھے کا شعور بلند تر ہے۔ اگر کوئی گدھے کو گدھا کہے تو مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کہنے والے کو کوئی شدید صدمہ تو نہیں پہنچا کہ وہ گدھے کے لئے اس قسم کے لایعنی اور قابلِ شرمندگی الفاظ کا استعمال کر رہا ہے۔ مگر کیا کہیں، زبان اور معاشرے میں قابلِ قدر گدھے صاحب کے لئے فقط گدھے ہی کا لفظ لغت اور عوام کی زبان پر زدِ عام ہے، چونکہ میں بھی گدھے کو گدھا ہی سمجھتا ہوں، اور کہہ رہا ہوں تو لازم ہے کہ یہ قانون مجھ پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے، جس

طرح دُوسروں پر لاگو ہوتا ہے، مگر میں نے اس کا ایک سیاسی حل نکالا ہے، وہ یہ کہ میں گدھے کو نہایت عقل مند قرار دے کر اپنے اور اُس کے مفادات کے تحفظ میں "بجت" گیا ہوں۔

میں گدھے کے بارے میں کسی قسم کے سیاسی بیانات نہیں دینا چاہتا، کیونکہ مجھے شدید خوف لاحق ہے کہ کہیں ان بیانات سے گدھے بُرا نہ مان جائیں، یا کہیں اُن کے حقوق پر ضرب نہ لگ جائے، یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں جس گدھے پر انشائیہ لکھ رہا ہوں، وہ تو بُرا نہ منائے بلکہ اُس کی برادری کے دیگر گدھے اور گدھوں کے قبائل، اس بات کو دل میں رکھ کر مجھے بلا وجہ انتقام کا نشانہ نہ بنانے لگیں، اور اس قسم کی دیگر وجوہات ہیں کہ میں گدھے کی عظمت اور مرتبے کا قائل ہو چکا ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ اگر آپ بھی گدھے اور گدھے کی نفسیات، اُس کی سُوجھ بُوجھ، اُس کے طریقۂ کار واردات، اُس کی احتیاجات اور اُس کی سیاسی بصیرت کو میری طرح تھوڑا تھوڑا سمجھ گئے تو ہو سکتا ہے کہ آپ گدھوں کی مُلکی یا عالمی کانفرنس طلب کر لیں، اور اُن کی عقل و دانائی کے میری طرح گُن گانے لگیں۔

گُن گانے سے یاد آیا کہ گدھے کو گانے بجانے سے بھی خاص رغبت ہوتی ہے۔ بعض احباب کا کہنا ہے کہ گدھے کو موسیقی سے اُنسِ لطیف ہے، وہ کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ گا سکتا ہے، اُس کی گائیکی دُنیا بھر میں مشہور ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ گدھے ایک ہی سُر میں سنگیت جگاتے ہیں، جس کو سب گدھے عالمی سطح پر بلا تکلّف نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ اُس کے سُر کے ساتھ سُر ملانے میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ موسیقی کا یہ اظہار و ابلاغ وسیع تر نظریات کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر بزرگ لوگ کہتے ہیں کہ موسیقی، گدھے رات بارہ بجے آلاپتے ہیں،

اُس میں جنات بھی پوری طرح مُلوّث ہوتے ہیں، وجہ اس ذکر کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ جنات جب رات بارہ بجے کے قریب انسانی بستی میں جا کر بھیس بدلتے ہیں تو اُن کا پسندیدہ رُوپ گدھا ہوتا ہے۔ جب وہ گدھے کا بھیس بدل لیتے ہیں تو تاریخ میں یہ لکھا ہوا بھی ہم نے پڑھا ہے کہ وہ "ڈھیچوں ڈھیچوں" کی لہر میں غزل سرائی کا آغاز کرتے ہیں۔ جناتی گدھوں کی یہ آواز بہت دُور تک، بڑے پُر اسرار انداز میں، رات کی تاریکی اور خاموشی کو چیرتی ہوئی، انسانی بستیوں میں گھس جاتی ہے۔ اس پُر اسرار اور ہیبت ناک، دہشت زدہ کر دینے والی آواز سے بستی کی مائیں، شرارتی بچوں کو توجہ دلا کر ڈراتی ہیں، اور کہتی ہیں — دیکھو مُنّے، اب تو سو جاؤ — اتنی رات ہو چکی ہے کہ جن بھی گدھے بن کر بولنے لگے ہیں — اکثر بے وقوف بچے ڈر جاتے ہیں، اور سو جاتے ہیں، یا پھر دُوسری قسم کے بچے سونے کی ایکٹنگ کرنے لگتے ہیں، اور ایک آنکھ میچ کر دُوسری آنکھ نیم وا کھول کر اماں کی حرکات وسکنات پر نظر رکھ کر، سوتے بن جاتے ہیں۔ ماں بے چاری سمجھتی ہے کہ بچہ بے چارہ گدھے کی آواز کی برکت سے سو گیا ہے۔ مگر بچہ کان سے گدھے کی آواز سُن رہا ہوتا ہے اور اَدھ کھلی یا میچی آنکھ سے دیگر مناظر کو سمجھنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اُسے سچ مچ نیند آ جاتی ہے۔

گدھے کی سیاسی بصیرت کا بہت کم لوگوں کو اندازہ ہے، کیونکہ گدھا ایک نہایت عقل مند اور ذہین جانور ہے، اس لئے اس کی سیاسی بصیرت بھی ایک وسیع نکتۂ نظر کی اُمیدوار ہوتی ہے۔ اس حوالے سے آپ کو یہی مشورہ ہے کہ آپ کبھی گدھے کی باتوں میں نہ آیئے گا کیونکہ اُس کا فکری شعور بعض مرتبہ زیبا اور کبھی نازیبا ہوتا ہے۔ جب گدھے کا شعور زیبا ہوتا ہے تو وہ بڑی مستی میں ہوتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ

مطلب نہیں ہے کہ گدھوں اور اُن کی صنفِ نازک میں رُخِ زیبا کا قحط ہے۔

میں پھر وہی پہلے والی بات کہوں گا کہ گدھے بہت عقل مند اور دانا ہوتے ہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت یہ ہے کہ گدھوں میں بھی برادریاں ہوتی ہیں۔ اس موقع پر یہ کہنا کہ گدھوں کی اعلیٰ و ارفع برادری گھوڑے، اور خچر ہوتے ہیں، کچھ مناسب نہیں لگتا ـــــ ہمارے ایک ماہر جمالیات و حیوانات کے ماہر دوست نے بتایا کہ اگر آپ گدھوں کے فیملی سسٹم پر تحقیق کریں تو اُن کا حسب نسب اُوپر کی جانب گھوڑوں سے ہے، اور نیچے کی جانب خچروں کے قبیلے سے جڑتا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ملا ہے کہ گھوڑوں کی، اور گدھوں کی اولادیں ہوتی ہیں جبکہ خچر اس کارِ خیر سے مبرّا ہیں۔ دُوسرے یہ کہ گدھے ان دونوں قبائل کے درمیان کی چیز ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ گدھے اِن دونوں کے وسطی قبیلے کے لوگ ہیں ـــــ یہاں پر یہ وضاحت کر دینا ازحد ضروری ہے کہ لوگ سے مراد قطعی طور پر گدھے ہیں۔ عام فہم محاورے سے متاثر ہو کر ہم نے گدھے کے لئے لوگ، اور لوگ کے لئے گدھے کا بے دریغ استعمال کر کے اپنی بات کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے، اور اپنی علمی ذہانت کو بیان کیا ہے۔ جہاں تک ہماری علمی ذہانت کے اعلیٰ ہونے کا ثبوت ہے تو وہ آپ کے سامنے ہے، یعنی ہم گدھوں پر ادبی قسم کا انشائیہ لکھ کر یہ ثابت کر رہے ہیں، اور اُمید کرتے ہیں کہ گدھوں پر لکھا گیا یہ انشائیہ نہ صرف گدھوں کے ادب میں مقبولیت پائے گا بلکہ غیر حیوانی ادب میں بھی اس کو پذیرائی ملنے کی قوی اُمید ہے۔

چونکہ گدھے، انسانی دُنیا میں رہتے ہیں، اس لئے اُن کے عظیم کارہائے نمایاں ہیں۔ اس سلسلے میں گدھوں کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ وہ بار برداری میں عالمی سطح پر انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ یہ خدمت گدھے بلا رنگ و نسل کرتے

ہیں۔ خواہ کوئی بھی مسلک ہو، یا کیسی بھی آب و ہوا ہو، یا آپ کیسی بھی بولی بولتے ہوں، گدھے خدمت کرنے سے قطعی جی نہیں چُراتے۔ علاوہ ازیں وہ آپ کی خدمت آپ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں۔ خصوصاً اس بات سے قطع نظر کہ آپ کے اختیار میں ایک یا ایک سے زیادہ گدھے ہیں، ہاں البتہ ان گدھوں کو ایک عقلی بیماری بھی ہے، جو ہر ملک کے گدھوں میں مشترکہ طور پر بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے، یعنی ''اڑ'' جانا ــــ اگر گدھا اڑیل ہو جائے اور کسی طرح بھی پیار سے، مار پیٹ سے نہ مانتا ہو تو بہت بے وقوف نظر آتا ہے۔ اس بیماری کا المیہ یہ ہے کہ یہ گدھوں کے مالکان میں بھی سرائت کر چکی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا ہے۔ مگر ہم تو گدھے کی اس حماقت اور بے وقوفی پر بات کر رہے ہیں کہ جب گدھوں کا دماغ کسی بات پر اَڑ جاتا ہے تو پھر وہ کسی طرح نہیں مانتے، گھاس بھی کھلاؤ تب بھی نہیں مانتے، خواہ مارو یا پچکارو، اپنی بات پر اَڑے رہتے ہیں ــــ ایسی صورت میں اگر گدھے کو گدھا بھی کہہ دو تو بالکل بُرا نہیں مانتا، کیونکہ اُس کا دماغ کام نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اَڑ چکا ہوتا ہے۔ علاج اُس کا حکیموں نے یہ بتایا کہ اُس گدھے کو اُس کے حال پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ وہ بے طرح واہیات بولنے لگے گا، جب دل کھول کر بول چکے گا تو آپ ہی سیدھا ہو جائے گا۔

اس گھمبیر مسئلے پر مُلا نصیر الدین اور اُن کا گدھا کافی بدنام ہیں۔ مُلا کے عظیم الشان گدھے پر دُنیا میں کئی کتابیں دستیاب ہیں، جن کو پڑھ کر آپ مزید تفصیل سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ مُلا نصیر الدین کے عالمی شہرت یافتہ گدھے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ احمق ہونے کے باوجود اتنے بڑے بڑے کام کر گیا کہ عالمی ادب کی انسانی تاریخ اُسے فراموش نہ کر سکی۔ ایسے گدھوں کی اَب قلت نظر آتی ہے۔ میرے

ایک دوست نے یہ بات سُنی تو بھڑک کر بولے — کوئی قلت نہیں ہے اللہ کے فضل سے؛ بس لکھنے والے اِس برادری سے خوف زدہ ہیں — میں نے کہا وہ کیسے — فرمانے لگے جانور تو جانور ہوتا ہے، عقل مند ہو یا بے وقوف — بھائی صاحب سب اُس کی دُولتی سے ڈرنے لگے ہیں؛ مبادہ پسلی نہ توڑ دے، پھر کون پوچھے گا — !

ذہین انسان، اپنی عقل کے بل بوتے پر گدھوں سے خوب کام لیتے ہیں، اور سب سے پسندیدہ اور معروف کام یہ ہے کہ اُسے کسی ریڑھی میں جوت دیا جائے؛ اُب چاہے ریڑھی پر کتابیں لاد دو یا کوڑا، سیمنٹ لاد دو یا ریت، بجری، اینٹیں، سب چلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خوش قسمت گدھا وہ ہے جو سبزی اور پھل فروٹ کی ریڑھی میں جُوتا جاتا ہے۔ پھل سبزی کھانے کو ملے نہ ملے، ہمہ وقت اُس کی تر و تازہ خوشبو تو آتی رہتی ہے۔ بس ایک پاک طینت اور صابر گدھے کے لئے اتنا ہی بہت کافی ہے۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ یہ تو سراسر ناانصافی اور گدھے کے ساتھ سیاسی ہاتھ ہے — دکھاؤ کچھ اور، کھلاؤ کچھ — میں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور گدھا، گدھا ہوتا ہے، اُسے بے وقوف بنائیں گے وہ تو آپ کا پیٹ بھرے گا، اور گھر بار چلے گا — میری بات سُن کر وہ رونے لگے۔ مجھے لگا کہ جیسے رات کے بارہ بجے ہیں اور جنات، گدھوں کا رُوپ دھار کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں، اور بستی کے باہر ویرانے میں لَوٹ لگا رہے ہیں — !

☆ حلقہ اربابِ ذوق لاہور، ۷ جولائی ۲۰۱۳ء کے تنقیدی اجلاس میں ڈاکٹر اختر شمار کی زیرِ صدارت اور ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی) (مہمانِ خصوصی) پڑھا گیا۔ اخبارات اور فیس بک پر ہر جگہ اس انشائیے کے بارے میں ایک جملہ کہا گیا کہ یہ انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے معیارِ انشائیہ پر فائز ہوتا ہے۔ ایسا کامیاب انشائیہ آج کل نہیں لکھا جاتا۔ اس میں بہترین انشائیہ زبان، بیان اور اسلوب کے ساتھ ہے، جس کا جواب آنا ممکن نظر نہیں آتا۔

مُنافع

انتباہ ـــ مطلع کیا جاتا ہے کہ زیرِ نظر تحریر ایک انتہائی خشک، ثقیل اور بے لذت ہے، اور چونکہ اس کا تعلق معیشت، لین دین اور نفع و منافع سے ہے، نقصان سے بالکل نہیں ہے۔ سو اس میں حسنِ نگارش اور خیال کی نزاکت قطعی ناپید اور عنقا ہے۔ اس کے پڑھنے والوں کو واضح طور پر مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو پڑھتے ہوئے کسی قسم کے رُوحانی، اخلاقی اور معاشرتی فائدے کی قطعی اُمید نہ رکھیں ـــ اس انتباہ کا مقصد عوام الناس کو

نقصان سے محفوظ رکھنا، اور نفع کے حصول میں سر، دھڑ کی بازی
لگوانا ہے، تاکہ اُن کی بدحالی کو خوشحالی میں تبدیل کر کے منافع
کی شرح کو مزید بلندی عطاء کرنے کا خاطر بندوبست ممکن بنایا
جا سکے ــــ اشتباہ ختم ہوا ــــ !

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ نفع کی لذت کا دیوانہ ہے۔ یہ لذت خواہ باذائقہ ہو یا بے ذائقہ، اس کا لطف و اِنبساط نرالا ہے، اس کے جائز یا ناجائز ہونے سے اُس وقت کوئی تعلق نہیں رہتا کہ جب معاشرے میں منافع کا رجحان پایا جاتا ہو، اور بازار میں مندی نہ ہو ــــ ذرا آسان اور سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ منافع، منافع ہوتا ہے، خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز ــــ جس کو نفع اور منافع کی لت پڑ جاتی ہے، اُس کی آنکھیں سوتے میں نفع اور جاگتے میں منافع سمیٹنے میں ہمہ تن مصروف رہتی ہیں۔

نفع اور منافع کے فرق کی ریاضی سمجھنے کے لئے ہمیں مبادیاتِ منافع جات کی جمع تفریق کو سمجھنا از حد ضروری ہے، جو اس طرح حل شدہ خلاصہ منافع ریاضی مطبوعہ اُردو بازار میں واشگاف الفاظ میں، پورے زیر زبر کے ساتھ درج ہے کہ نفع وہ آمدنی ہے جس کو تھوڑا بہت زرِتلافی یعنی ٹیکس دے کر محکمہ تلاشِ آمدنی سے باعزت چھڑایا جا سکتا ہے، اور جبکہ منافع وہ آمدنی ہے کہ جس کا کسی کو کانوں کان علم نہیں ہو پاتا۔ محکمہ تلاشِ آمدنی بھی اُس تک رسائی نہیں رکھتا، اور جس منافع کی مقدار حدیں پھلانگ جائے تو خود مالکِ منافع کو بھی علم نہیں رہتا کہ وہ کس حد تک منافع میں پھلانگتا چلا جا رہا ہے۔

مالیات کی کتاب کے صفحہ و باب منافع جات میں درج ہے کہ اس میں کوئی

شرط ایسی نہیں ہے کہ اس کے کوئی عملی یا اسباقی قواعد، قابلِ تحریر دستیاب ہوں۔ کتاب مالیاتِ منافع میں یہ بھی لکھا ہے کہ منافع کے حصول کے لئے کوئی قید بھی نہیں ہے — بس آپ کے ذہنِ رسا میں مجرمانہ سوچ کے عملی عناصر ہونے چاہئیں، اور اُن پر بے دریغ عمل کرنے کے لئے 'ضمیر کا نہ ہونا' مردہ ہونا، یا بے حس ہونا اشد ضروری ہے۔
اگر کسی میں اِسمِ ضمیر کی مذکورہ بالا تینوں خصوصیات، سلیقے اور قرینے کی حسبِ ضرورت، ترتیب، موقع کے مطابق پائی جائیں تو شرحِ منافع دن دُوگنی اور رات چوگنی ترقی کر جاتی ہے، جس سے پہلا نتیجہ یہ ظہور میں آتا ہے کہ تین مرلے کا گھر، تین کنال کی سوئمنگ پول والی کوٹھی میں، سائیکل درآمد شدہ کرولا کار میں، اور روز رات کا کھانا فائیو سٹار ہوٹل میں تناولِ ماحضر کے طور پر شروع ہو جاتا ہے — ہاں البتہ اِس کھانے سے کچھ خاص قسم کے اثراتِ امیرانہ پیدا ہونے لگتے ہیں، جن کا ذکر عام لوگوں میں بار بار کرنے سے آپ کی امیرانہ بُود وباش کے ڈنکے بجنے لگتے ہیں۔ مثلاً شوگر ہو جاتی ہے، پھر آپ سب کو بآسانی بتاسکتے ہیں کہ آج میرے جسم میں شکر کا عام اوسط ریٹ 450 سے زیادہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ یہی حال بلڈ پریشر کا ہوتا ہے، اور آپ ہر کس وناقص پر جائز، ناجائز غصہ نکال کر بڑے اطمینان اور مزے سے بتاسکتے ہیں کہ یار ابات یہ ہے کہ میرا بلڈ پریشر بڑھا ہوا جا رہا ہے — یہ سب منافع کی باتیں ہیں، جن کی باریکی کو کوئی شریف آدمی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا، جب تک کہ وہ مزید ایک اور کتاب، بعنوان طریقہ حصول شرحِ منافع، مطبوعہ معاشیات کتب خانہ اُردو بازار کے باب اوّل، صفحہ 420 کا مطالعہ سیر حاصل نہ کرلے۔
ہوسکتا ہے آپ یہ سُن کر بہت حیران ہوں کہ منافع کی زیادتی خواہ مخواہ نفع کو بڑھاتی ہے — جی ہاں — یہ بہت باریک بات ہے، جس کی تائید ایک

ماہرِ عملیات منافع سرِ دھن کر، کر سکتا ہے، مگر ایک عام آدمی جو فقط نفع کے بارے میں سوچتا ہے وہ اس باریک بات کی رُوح تک سرِ دھننے کے باوجود نہیں پہنچ سکتا۔

تفصیل اس اجمالِ منافع جات، باتفصیل یہ ہے کہ مایا کو مایا ملے، کرکر لمبے ہاتھ — حضور سمجھنے کی کوشش کریں، اگر نہیں سمجھ آرہا تو مزید سمجھنے کی کوشش کریں۔ نفع ایک ایسی چڑیا ہے جو کبھی بھی پھُر سے اُڑ سکتی ہے، نفع کی چڑیا کے اُڑ جانے کے نتیجے کو تو آپ بخوبی سمجھتے ہوں گے کہ پھر اُس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ مگر منافع ایک ایسے عاقل و بالغ کوّے کی مانند ہے کہ جو منافع کی خاطر، گھڑے میں کنکریاں ڈال کر پانی کی سطح کو اپنی ازل سے پیاسی چونچ کے برابر کر لینے کا گُر جانتا ہے۔ اب یہ مزید جتانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے کہ عاقل و بالغ کالے کوّے میں اور کیا کیا بامنافع کر دینے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ البتہ منافع خواہ مخواہ بڑھانے کے لئے ہر کالے کام کی خاص ضرورت ہوتی ہے اور کالا کوا ہو تو یہ منافع مزید منافع میں باسانی بدل جاتا ہے؛ جس سے منافع دار کو خاص رُوحانی سکون اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ خواہ اس کے اس عمل سے لوگوں کے گھروں میں کالا اندھیرا چھا جائے۔ اس کے جواب میں وہ یہ دلیل دیتا نظر آتا ہے کہ میں نے ایسا کوئی کام انجام نہیں دیا کہ جس سے اندھیرا پھیلتا ہو — مزید جوابی دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر اندھیرے کا یہ عالم ہوتا تو میرے گھر میں بھی کچھ نہ کچھ اندھیرے کا تابناک اثر ہوتا — یہ کہہ کر وہ قریبی مسجد میں عبادت کو چلا جاتا ہے، اور مسجد میں اندھیرا دیکھ کر فوراً ایک عدد جنریٹر مسجد کو ہدیہ کر دیتا ہے۔ پھر اہلِ مارکیٹ اور اہلِ محلّہ کو روک روک کر بتاتا ہے کہ میرے سے مسجد میں اندھیرا دیکھا نہیں گیا۔ اللہ نے بڑا دیا ہے — لعنت ہے میرے اس منافع پر کہ میں مسجد کے اندھیرے کو روشنی میں نہ بدل دُوں۔ یاد رہے کہ اُس نے اس منافع سے مسجد کو جو

جنریٹر گفٹ کیا ہے اُس کے اجمال کی مختصر تفصیل راوی نے یوں بیان کی ہے کہ حضرت صاحب بچوں کا ڈودھ، نقل بمطابق اصل بنانے اور اُسے بیچنے کے عظیم فنکار ہیں، جس میں شرح نفع نہ ہونے کے برابر اور شرح منافع پچاس پر پانچ سو روپے، اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔

کہنا ایسے عظیم اور وطن فروش لوگوں کا یہ ہے کہ نفع ' قابلِ گرفت' قابلِ تفصیل اور قابلِ ٹیکس چیز ہوتی ہے، جس پر سرکار شریف اور اُس کے نانجار کارندوں کی گہری اور نابکار عقابی نظر ہوتی ہے۔ جیسے عقاب ہزاروں فٹ کی بلندی سے گھنے جنگل میں جھاڑیوں کے درمیان لپکتا چوہا دیکھ لینے پر قادر ہوتا ہے، اُسی طرح نفع پر نظر لگائے ہوتے ہیں۔ ان کو چمگادڑ کی طرح رات کو بھی نظر آتا ہے۔ یہ سرکار کو بھی کچھ حصہ نذرانے میں پیش کرتے ہیں، اور باقی زرِ کثیر خود مِل کر تناول فرماتے ہیں۔ حق سرکار کا ہوتا ہے اور نوش جان یہ کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ اتنا کچھ صرف کر دینے کے بعد بھی سرکار بھوکی رہتی ہے۔ کارِ سرکار چلانے کے لئے کبھی اُس سے قرض مانگ، کبھی اُس جائیداد کو بیچ، مگر پھر بھی پوری نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ یہ عقاب ہر جگہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اُن کی چونچ میں آیا اور پنجوں میں پھنسا شکار کبھی بچ کر نہیں نکلتا۔ اس طرح شرح نفع، شرح منافع لامحدود میں بدل جاتا ہے۔ ہاں البتہ جو کاروبار، اُن کے باہمی اشتراک سے برائے شرح لامحدود منافع ترتیب دیا جائے؛ اُس میں نفع کثیر الکثیر اور خرچہ محدود المحدود قرار پاتا ہے، اور ہزار قسم کی لکھت پڑھت سے نجات بھی ہو جاتی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو عمل کر کے دیکھیں، ابھی ایک چلّہ نہ گزرے گا کہ نوٹوں کے رنگ برنگے مؤکلات کی نہ صرف آمد و رفت شروع ہو جائے گی بلکہ ایسے ایسے جہان آباد نظر آنے لگیں گے جو نماز روزہ کرنے سے بھی قطعی

نظر نہیں آتے۔ بس شرط اس کے لئے فقط اتنی ہے کہ آپ کے اڈے کا حصار مضبوط اور وظیفہ کامل ہونا چاہیے، باقی کام موکلینِ دولت خود انجام دیں گے، جو آپ کو اس چلّے کے دوران بآسانی ملتے چلے جائیں گے کہ کاروبار منافع پر منافع دینے لگے گا۔ گویا رات چاندنی اور دن اُجالا ہو گا ——— باقی ہر سُو اندھیرا ہوتا ہے تو بلا سے، ہمیں تو اپنے چلّے، منافع اور مُوکل سے غرض ہے۔

ہاں یہ بتانا از حد ضروری ہے کہ اس عملِ باموکل جامع کو پیروں فقیروں نے عمل منافع کثیر کا نام دیا ہے، جو باعمل لوگوں کو غیب سے عطا ہوتا ہے اور دستِ غیب بن کر راتوں رات ظاہر ہوتا ہے، مگر کہتے ہیں، دیکھا نہیں کہ انجام اس عمل کا عبرت ناک ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور کتاب بھی بازار منافع خوری کے گھٹیا اور ناقص نام سے دستیاب ہے۔ چونکہ اس کتاب پر حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے، اس لئے یہ زیرِ زمین بافراط ملتی ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خریدار ضمیر فروش اور باطن سے بے حس و حرکت ہو، دماغ اُس کا تیز، حوصلہ بلند اور باضمیر افسروں کو خریدنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہو، اس لئے اس کتاب پر بین ہے، اس کو رکھنا اور فروخت کرنا قابلِ تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔ حل اس کارِ حرام کا یہ نکالا گیا ہے کہ تنخواہ روک لو، جب خاندان سمیت بھوکا مرے گا تو خود بخود وہ اس گردشِ افلاک میں شامل ہو جائے گا، اور حرام کو حلال کہنے لگے گا کیونکہ تین دن بعد حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔

maablib.org

انسپکٹر

بنیادی طور پر انسپکٹر ایک خوفناک بندے کا نام ہوتا ہے، جو شکل کا خوفناک ہو یا نہ ہو مگر مشہور یہی ہے کہ اعمال چہرے پر بھی لکھے ملتے ہیں۔ آپ لازماً سوچیں گے کہ آخر ماں باپ نے ایک معصوم سے بچے کا نام ایسا خوفناک کیوں رکھا۔ کیا دُوسرے نام دُنیا سے ختم ہو گئے تھے، یا ناموں کا قحط پڑ گیا تھا؟۔ یہ وہ سوال ہیں جو بعض اوقات ایک شریف آدمی کو خواہ مخواہ ہراساں کر کے پریشان کر دیتے ہیں، جبکہ قصہ اس کے سراسر برعکس ہے۔

وہ پیدا ہوا تو اُس کا نام ماں باپ نے باہمی رضامندی اور قریبی رشتے

داروں سے طویل مشورے کے بعد محمد بُوٹا رکھا۔ محمد بُوٹا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کوئی چوبیس سال کی عمر میں شہر نوکری کے لئے گیا، ایک دن گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں خبر آئی کہ وہ محمد بُوٹا سے انسپکٹر ہو گیا ہے۔ پورے گاؤں اور قصبے میں اُدھار لے کر مٹھائی بانٹی گئی کہ جس اُدھار کی آج تک ادائیگی نہیں کی گئی، اس کے بعد وہ محمد بُوٹا سے انسپکٹر کہلانے لگا اور اَب تک انسپکٹر کہلاتا ہے۔ اُس کی بیوی انسپکٹر کی بیوی اور بچے انسپکٹر کے بچے کہلاتے ہیں۔ شہر میں اور دیگر جاننے والوں میں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کو اب یاد ہی نہیں رہا کہ وہ پیدا محمد بُوٹا ہوا تھا۔ جب سے وہ انسپکٹر ہوا ہے، لوگوں کی کثیر تعداد اُس کے اس نئے نام نما عہدے سے بالکل اُسی طرح خوف کھاتی ہے، جیسے کوا، غلیل سے خوف کھاتا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر غلیل ایک بے ضرر ہتھیار ہے، جس کو بعض لوگوں کے نزدیک ہتھیار کہنا بھی، ہتھیار کی توہین ہے۔ اصل میں غلیل سے چلنے والا غلّہ خطرناک ہتھیار ہے، جس کے چلنے کی آواز بھی نہیں ہوتی؛ ہاں البتہ لگنے کے بعد جو انسانی چیخ کی صورت میں آواز نکلتی ہے، وہ قابلِ ذکر ہو سکتی ہے، جس سے غلیل اور غلّے کے ہتھیار ہونے کی بابت پتہ چلتا ہے، اور المناک شواہد ملتے ہیں ـــ وہ صاحب کہہ رہے تھے کہ بھائی انسپکٹر تو ایک غلیل ہوتا ہے، وہ خطرناک چیز ہے، اور اگر انسپکٹر قانون کا غلّہ مارنے یا استعمال کرنے میں طاق ہو جائے تو ہر کس و ناقص اُس سے دُور بلکہ بہت دُور بھاگتا ہے ـــ اگر انسپکٹر کی غلیل سے قانون کا غلّہ نکال دیا جائے تو اُس کی حالت یہ ہو جائے گی کہ پھر سے سارے بستی والے اُس کو محمد بُوٹا، محمد بُوٹا کہنے لگیں گے۔ بلکہ یقین ہے کہ وہ کبھی صاحب بھی نہ کہلایا جائے گا، کیونکہ وہ عالمی سطح پر عوامی انتقام کی زد پر ہوگا۔

اگر کسی انسپکٹر کے پاس قانون کا غلّہ نہ ہو تو اُس کی ساری کی ساری انسپکٹری

دھری کی دھری رہ جائے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ جب انسپکٹر ریٹائر ہو جاتا ہے تو وہ باقی زندگی محمد بوٹا کے نام سے گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ اُس کی بے بسی اور بے کسی کا لاچار ترین زمانہ ہوتا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اُس کی انسپکٹری کا یہ حال ہوتا ہے کہ کوئی اُسے گھاس بھی ڈالنا پسند نہیں کرتا، اس لئے کہ سب جانتے ہیں کہ محمد بوٹا کے انسپکٹری کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ سو گزشتہ صدی کے سارے انتقام اُس سے ہر گلی کے موڑ پر لئے جاتے ہیں، اس لئے کہ اَب وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بس اتنا کر سکتا ہے کہ اپنے گھر کے دروازے پر ایک مٹیالے کے رنگ کی تختی پر اپنا نام جلی حروف میں لکھ کر اُس کے آخری میں چیونٹی یا مکھی کے سائز کا لفظ ریٹائرڈ لکھ دیتا ہے تا کہ کمزور نظر والے، حسب سابق اُس کی وحشت میں مبتلا رہیں۔

ریٹائر ہونے کے بعد چونکہ اُس کے ڈنگ سے زہر نکل چکا ہوتا ہے اور بے زہر کے ڈنگ والا سانپ ایک کیچوے کے برابر ہوتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ برسات میں بچے کیچوے کے ساتھ نمک ڈال کر کیا سلوک کرتے ہیں — سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ بعد از وفات انسپکٹر کو قبرستان میں گورکن بھی جگہ فراہم کرنے سے معذرت کر لیتا ہے، وجہ اس ظلم کی یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنی انسپکٹری کے دور میں اتنے آدمی، قانون اور انسپکٹری کے غلّے سے ناحق شہید کئے کہ پورا قبرستان بھر چکا ہے، اور اَب اِن حضرت کے لئے جائے دفن دستیاب نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں اگر کہتے ہو تو اِس کو اِس کے مارے غلّے سے کسی غریب کی قبر میں بطور دُوسرا دفن کر سکتا ہوں — اِس عمل کے بعد کیا ہوگا: مجھے نہیں پتہ — وجہ اس کی وہ یہ بیان کرتا ہے کہ میں نے گزشتہ سال ایک انسپکٹر کو اس کے گزیدہ شخص کی قبر میں جگہ نکال کر اُتار دیا مگر اگلے روز قبرستان کی دیوار کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے اور اس بات پر واویلا

کر رہے تھے کہ آخر یہ دفن شدہ مردہ، قبر سے نکل کر قبرستان کی دیوار کیسے ناپ کر باہر آ گیا، اور دوبارہ مر گیا ـــ میڈیا اس مسئلے کو براہِ راست کوریج دے رہا تھا ـــ !

سنا اور دیکھا ہے کہ جب کوئی بندہ، بندے سے انسپکٹر بن جاتا ہے تو اللہ، رزق کا ہر دروازہ اُس پر کھول دیتا ہے ـــ ایک صاحب جو بہت دل جلے اور انسپکٹر گزیدہ تھے، چمک کر کہنے لگے ـــ توبہ توبہ ـــ اللہ نہیں کھولتا یہ دروازہ، کوئی اور کھولتا ہے مردود۔ کسی نے مچل کر کہا حضرت اُس کا نام تو لیں تو تھوک کر فرمانے لگے، اللہ نے اُس پر لعنت فرمائی ہے، میں اپنی زبان ناپاک کیوں کروں ـــ مگر میرا خیال مذکورہ بات سے ذرا مختلف ہے، وہ یہ ہے کہ جس رزق پر "**ھذا من فضل ربی**" پڑھ لیا جائے، وہ کیسا ہی غیر پاکیزہ ہو، پاک اور پوتر ہو جاتا ہے۔ ایک اور پاک کرنے کا طریقہ بعض پیروں نے یہ بتایا ہے کہ روزانہ صبح بیوی کو پچاس، پچاس کے کچھ نوٹ دے کر گھر سے نکلا کرو، اس سے دونوں طرف برکت ہو جاتی ہے، یہ نوٹ بیوی شاپنگ کرنے سے پہلے اور بعد میں مارکیٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھے معذور نما فقیروں میں فراخ دلی سے خیرات میں اللہ کے نام پر عطا کر کے مال پاک کر سکتی ہے۔ اس عمل سے نا صرف دولت کی دھاک بیٹھتی ہے بلکہ مال میں اللہ کی رحمت شامل ہو جاتی ہے، اور سامنے والی بھوکی پڑوسن کی نظرِ بد سے بھی خاطر خواہ، بچاؤ ہو جاتا ہے۔

اَب یہ نا سمجھا جائے کہ انسپکٹر ہو جانے کے بعد اُن کے دل خوفِ خدا سے، خدانخواستہ عاری ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، یہ دل بڑے نازک ہوتے ہیں، بس ذرا سی نظرِ کرم اِن کے دل کو موم کر دیتی ہے، اور ایسا موم کرتی ہے کہ آپ جو چاہے کرتے پھریں، چاہے دندناتے پھریں، یہ آپ کو قانونی طور پر معاف کر دینے کی لامحدود قوت سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اِن کا دل بلکہ دماغ تک موم ہو

چکا ہوتا ہے۔

اگر انسپکٹر صاحب موصوف، ضرورت سے زیادہ موم ہو جائیں تو وہ آپ کو اپنا قریبی دوست ڈکلیئر کر دیتے ہیں، اس امر کی خاص الخاص نشانی یہ ہے کہ اُن کی رسائی آپ کے دولت کدے تک ہو جاتی ہے، پھر اگر قریبی دوست سے بھی زیادہ ترقی کر جائیں تو یار بیلی بن جاتے ہیں، جب وہ یار بیلی بن جاتے ہیں تو اُن کی رسائی آپ کے اندرونِ خانہ تک احسن طریقے سے پائی جاتی ہے، اور یار لوگ آپ کو اُن کا اور اُن کو آپ کا ہم لنگوٹی کہنے لگتے ہیں ___ اگر صورت حال یہاں تک موجود ہو تو آپ کو چاہیے کہ آپ انسپکٹر کے یار بیلی، لنگوٹیے سے اچھے تعلقات رکھیں، ورنہ کسی بھی وقت آپ کا دھڑن تختہ ہو جانے کا واضح امکان ہے، ایسی صورت میں آپ کو کوئی بچانے نہیں آئے گا۔

ہم نے ابھی تک انسپکٹر کی اقسام کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ یقین مانیے، ہم اقسامِ انسپکٹر پر کوئی بات کرنا بھی نہیں چاہتے، بس اتنا عرض، دست بستہ کر سکتے ہیں کہ یہ ہر محکمے میں بدرجہ اُتم پائے جاتے ہیں۔ محکمہ کوئی قدم، اُن کی تحقیق و عملی تعمیل کے بغیر ہرگز ہرگز نہیں اُٹھاتا۔ اُن کا لکھا نوٹ ہمیشہ باتحقیق فائنل شمار ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے پھندہ فٹ کر دیا ہے تو اب کوئی چھڑا نہیں سکتا، اور اگر پھندہ لگا ہوا اُتار دیا ہے تو کوئی مائی کا لال پھندہ فٹ نہیں کر سکتا۔ تحریر حتمی، بابت تحقیق ہمیشہ درست اور قابلِ یقین قرار دی جاتی ہے، اس تحریر سے قبل اگر آپ موم نہ کر سکے تو یہ سراسر آپ کا قصور شمار ہوگا، ورنہ وہ تو نیک دل آدمی ہیں، ہمہ وقت موم ہونے کو تیار ہوتے ہیں، ورنہ یار بیلی کے ذریعے، اندرونِ خانہ موم ہو ہی جاتے ہیں۔

انسپکٹر کی سوشل لائف بہت باوقار اور عظیم الشان، عزت والی ہوتی ہے۔ ہر

کوئی اُن کو عزت واحترام سے بے دریغ نوازتا ہے، بڑے بڑے معزز لوگ اُن کو آتا دیکھ کر اپنی کرسی چھوڑ کر دست بستہ ہو جاتے ہیں —— وہ خود فدویانہ طریقے سے اُن کے حضور کھڑے رہتے ہیں، اور انسپکٹر صاحب کرسی کے سامنے پڑے میز پر پاؤں پسار کر ایسے براجمان ہوتے ہیں کہ اس منظر کو دیکھ کر، خواہ مخواہ اللہ اکبر کہنے کو جی چاہتا ہے۔ شاید اس عملِ صالح سے انسپکٹر صاحب سامنے کھڑے معزز شخص کو یہ باور کراتے ہیں کہ بیٹا اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے، اور دُوسرے یہ کہ اللہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے ایک ٹانگ پر یوں کھڑا کر دیتا ہے، جیسے تم کھڑے ہو —— مگر ہم اس سب کے مقابل دو مختصر واقعات کی طرف توجہ دلانے کے خواہش مند ہیں۔ ایک انسپکٹر صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا، اُن کے جنازے میں اللہ جھوٹ نہ بلوائے کوئی چار پانچ ہزار معزز اور غیر معزز افراد موجود بلکہ حاضر وناظر تھے۔ نمازِ جنازہ کے وقت نہ جانے کیسے تعداد مزید بڑھ گئی —— مگر جب خود انسپکٹر صاحب کا انتقال پُر ملال ہوا تو لے دے کر پچیس آدمی بھی مشکل سے تھے۔ یہ ہے اس عظیم الشان و نایاب عہدے کی غیر مرئی طاقت، جس کا سرچشمہ انسپکٹری قرار دیا جا سکتا ہے۔

دین داری، پرہیز گاری اور شرافت ونجابت سے اُن کو خاص قرابت داری ہے۔ ثبوت اوّل اس کا یہ ہے کہ یہ پورا ہفتہ پینٹ شرٹ زیب تن کرتے ہیں، ماسوائے جمعۃ المبارک —— جمعہ کو باقاعدگی سے کلف لگا شلوار قمیض اور عُمرے سے تحفے میں آئی ٹوپی پہنتے ہیں۔ اِدھر نمازِ جمعہ کا خطبہ شروع ہوا اور یہ خضوع وخشوع کے ساتھ بار بار اعلان کرتے ہیں —— یار جلدی کرو، جمعہ قائم ہونے والا ہے —— رمضان شریف میں تو پینٹ شرٹ کو روزِ عید تک قطعی طلاق دے دیتے ہیں۔ رمضان کا پہناوا صرف شلوار قمیض، واسکٹ اور مکہ مدینہ سے تحفے میں آئی خاص ٹوپی ہوتی ہے،

یہ ایسی واسکٹ، رمضان میں پسند کرتے ہیں جس کی بیرونی جیبوں کے علاوہ اندرونی استر میں چھ یا چھ سے زائد مخفی اور گہری جیبیں ہوں، اور ہر جیب پر زپ نہیں تو کم از کم بٹن ضرور لگا ہو، تاکہ اندر کا مال سجدے کی حالت میں مسجد کی صف پر پھیل کر ڈھیر نہ ہو جائے، اور خواہ مخواہ شرمندگی سے دوچار ہونا پڑے، اور اُسے دوبارہ سمیٹنے میں وقت ضائع کرنا پڑے۔

کبھی، کبھی چیدہ چیدہ ایسے انسپکٹر بھی حسنِ اتفاق سے مل جاتے ہیں جو انسپکٹری کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ شمار ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہوتے ہیں کہ جن کے پاس نہ تھیلی ہوتی ہے، اور نہ ہی غلّہ؛ نہ وہ جمعے کو چھ جیبوں والی واسکٹ پہنتے ہیں، حق دار کا کام اپنے پلّے سے چائے پلا کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ کرتے ہیں ۔۔۔ افسروں کی ڈانٹ پھٹکار صبر کا گھونٹ سمجھ کر شیریں جام کی طرح غٹ غٹ پی جاتے ہیں، دفتر کا غصہ گھر کی بی بی پر نہیں نکالتے، روز بلا ناغہ معطل ہوتے ہیں، اتنی ٹرانسفریں ہوتی ہیں کہ جتنی اُنہوں نے زندگی میں گنڈیریاں نہیں چوسی ہوتیں۔ اِن انسپکٹروں کے گھروں میں رحمت کے لفافے والے فرشتے، انسانی رُوپ میں نہیں آتے، بلکہ غربت ڈیرے ڈالے رکھتی ہے۔

موتیے کا پھول

جون کا مہینہ ہو، گرمی اپنے شباب پر ہو، اور چاندنی رات ہو — کبھی کبھی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا مچل کر آتا ہو اور لپک کر گزر جاتا ہو، رات کے اندھیرے میں، ہوا کے جھونکے کے ساتھ جو بھینی بھینی خوشبو، کیاری کی طرف سے آتی ہو؛ وہ دل و دماغ کو عجیب تازگی اور لطیف قسم کی زندگی کے احساس سے آشنا کرتی ہو۔ اُس خوشبو میں کئی طرح کی اور خوشبوئیں بھی شامل ہوں، مثلاً صحن میں چھڑکاؤ سے پیدا ہونے والی، مٹی، پانی اور ہوا کی خوشبو — پھول کی خوشبو جو سامنے قطار میں کھلے ہوں اور موتیے کے ہوں — !

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ گرمیوں کے مہینوں میں کون کون سے پھول کھلتے ہیں تو کافی نام زیرِ غور آ جائیں گے۔ پھر اس سے اگلے مرحلے میں اُن کے رنگوں کو عالمِ نظر میں لایا جائے تو اُن میں چار رنگ نمایاں ہوں گے۔ زرد گیندے کا، سُرخ گلاب کا، اُودا کاسنی کا، اور سفید موتیے کا ـــــ اب ان کی خوشبوؤں کو عالمِ تصور میں لائیں تو گلاب کی خوشبو بہت مری مری اور جلی ہوئی محسوس ہو گی۔ کیونکہ گرمیوں میں گلاب صبح تڑکے میں کھلتا ہے، اور بس دن چڑھے تک ایسے مُرجھا کر سیاہ اور ٹھگنجا ہو چکا ہوتا ہے کہ کسی کے کام کا نہیں رہتا، نہ وہ سُونگھنے کے لائق ہوتا ہے اور نہ جُوڑے میں سجانے کے لائق۔ گلاب بے چارہ ہلکی سی خنکی مانگتا ہے، جو ایسی جھلسا دینے والی گرمی کی صبح میں اشراق سے پہلے پہلے ختم ہو کر ایسی خوفناک تپش دار لُو میں بدل جاتی ہے کہ الامان الحفیظ ـــــ اس بے چارے گلاب کی کیا ہمت کہ یہ ایسی آگ لگا دینے والی گرمی میں اپنے حسن کی بہار دکھانے کی جرأت کرے۔ بس چند منٹوں میں جھلس کر سیاہ، مُرجھا ہو جاتا ہے، نہ کسی کے بالوں میں سجنے کے لائق رہتا ہے، اور نہ ہی گلے کا ہار اُس سے بن سکتا ہے۔ ہاں بس ایک ہی حل ہے کہ صبح تڑکے میں کہ جب بادِ صبا، گرمی کی آمد کا بگل بجائے، اس سے پہلے پہلے توڑ کر برف کی ٹوکری میں سنبھال دو، مگر مجھے تو وہ بھی بے کار نظر آتا ہے، اس لئے کہ جُونہی اُسے برف کی ٹوکری کے ائیر کنڈیشن سے نکالو گے تو وہ تمازتِ ماحول سے جھلسنے لگے گا، کہ خاکستر اور مُرجھا ہونے میں چند منٹ نہ لگیں گے، رہی اُس کی خوشبو تو اُس کا حال اور بُرا ہوتا ہے، وہ بھی اُس کے بدن کی حسین سُرخی کے سیاہی میں بدلنے سے پہلے پہلے، قفسِ گلاب سے پرواز کر جاتی ہے، اب بس ایک سُوکھا، بے خوشبو کا مُرجھایا گلاب ہی باقی رہ جاتا ہے، جس کو نا کوئی محبوبہ کے بالوں میں سجانا پسند کرتا ہے، اور نہ ہی کتاب میں رکھنا

گوارا کرتا ہے۔ سو گرمیوں کے گلاب کی کہانی صبح ہی صبح اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

دُوسری کہانی اُس گیندے کے پھول کی ہے جو گرمیوں میں کھلنے کے لئے کسی بڑے اور گھنے درخت کی جڑوں کی ٹھنڈک کی پناہ تلاش کر کے بڑی مشکل سے کھلتا ہے۔ سردیوں میں کھلے تو تُو بُرتُو ہوتا ہے، سینہ تان کر کھلتا ہے، اور زرد ہونے کی سی بہار دیتا ہے کہ گلشن، دُور سے دیکھو تو سونے کی ٹکریوں سے آراستہ دکھائی دیتا ہے، خوشبو اُس کی محدود ہوتی ہے، صرف اُسی کو سنگھائی دیتی ہے جو اُس کو ناک کے نتھنوں میں گھسیڑ کر سُونگھنے کی کوشش کرے، باقی لوگ جو دُور دُور سے اُس کے حسن و شباب کا لطف اُٹھانے کے عادی ہیں، وہ صرف نظروں ہی نظروں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مہندی کی دُلہن سے اس کو خاص اُنسیت ہے۔ جیسے وہ پیلی پیلی بڑی حسین لگتی ہے، اُسی طرح یہ بھی پیلا پیلا رومان پھیلاتا ہے، خوشی سے آراستہ مگر ذرا دُکھی دُکھی، جیسے خون نچوڑ لیا ہو، اور رومان بھرا جا رہا ہو۔ گیندے کے پھول اور مہندی کی دُلہن میں کئی باتیں مشترک ہیں، جن میں اُداسی اور پھول کی زردی کا ملاپ ایک سی قدریں پیدا کرتا ہے۔ دُلہن بھی زرد اُداسی میں ڈوبی ہوئی، اور پھول بھی زرد اُداسی کو چار چاند لگاتا ہوا، مہندی کی دُلہن کے بالوں اور گجروں میں اِس کی بھیگی بھیگی زردی، دُلہن کے زرد لباس سے مل کر قیامت بھی ڈھا دیتی ہے، یہاں تک کہ اس پھول کی بدولت، دُلہن کی اُداسی میں شادی کا رومان لہریں لیتا دکھائی دیتا ہے۔

کاسنی کے پھول بھی کڑک گرمیوں میں، گھنے درختوں کی نرم و نازک چھاؤں میں ستاروں کی طرح کھلتے ہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے، نرم و نازک یہ پھول ہر اعتبار سے دل و جگر کو سکون اور قلب کو راحت دیتے ہیں۔ نہ اِن سے کوئی ہار بنتا ہے اور نہ اِن سے کوئی سنگھار کرتا ہے۔ اِن کے اصل عاشق حکیم ہیں، جہاں کہیں کسی

حکیم صاحب کو کاسنی کے پھولوں کی گھنی جڑی بوٹیاں نظر آئیں، وہ وہیں اُن کو اپنے کُرتے کے دامن میں محبت سے سمیٹ لیتے ہیں، تاکہ کسی جگر سوختہ کو راحت دینے کا سامان تیار کر سکیں۔ بس سمجھو کہ کاسنی کا پھول دل کو راحت اور جگر کو تقویت دینے کے کام آتا ہے، وہ بھی مستند حکیم کے ہاتھوں ـــــ اِس کا رومان فقط دیکھنے کی حد تک ہے، نہ خوشبو نہ سنگھار، بس حُسن میں مشہور ہے کہ جب کھلا ہو تو آنکھوں کو تراوٹ دیتا ہے، اور کسی نوعمر حسینہ کے حسن سے کنوارگی کی حد تک لگا کھاتا ہے، اتنا کہتے ہیں کہ وہ تو ابھی کاسنی کے پھول جیسی ہے ـــــ !

دُنیا بھر کے حسین ترین پھولوں کی اکثریت کا دستور ہے کہ وہ برف پگھلتے ہی اور سردیاں ختم ہوتے ہی اپنی بہار کا جوبن اور جوانی کے حسن کی پھبن دکھانا شروع کرتے ہیں۔ جب سردی، گلابی سردی میں حلول کرتی ہے اور سُورج کی ہلکی ہلکی لطیف تمازت، منجمد کو غیر منجمد کے عمل میں داخل کرنا شروع کرتی ہے: بس اَب سمجھو کہ بہار آئی۔ لطیف جذبات کے اظہار کو بھی بہار کہتے ہیں، حُسن کی بانہوں کے وا ہونے کو بھی بہار کہتے ہیں، حسین، زیرِ لب مسکراہٹ کو بھی چہرے کی بہار کہتے ہیں، حسینہ کے پیار کے اظہار کو بھی بہار کہتے ہیں، گویا ہر اُس عمل کو بہار کہتے ہیں جو رُوح میں نکھار پیدا کر دے، اور جذبوں میں ترنگ اُبھار دے۔ ایک دُوسرے کی محبت میں اُتر جانے سے پہلے کے مرحلے کو بھی بہار کہتے ہیں، رُوح کی مستی کو بھی بہار کہتے ہیں، جب رنگ رنگ کے حسین و جمیل پھولوں سے زمین کا بنجر فرش سجنا شروع ہو جائے تو بہار کا پیغام آیا سمجھو۔ یہ برف پوش وادیوں کا احوال تھا، اِدھر میدانوں میں جب شدید گرمی نے خطۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا، اُدھر پھولوں کے گال گرمی سے تمتمائے اور ذرا سی دیر یا ایک ہی گرم دوپہر میں جھلس کر مٹی ہو گئے، کون سی بہار اور کون سا رنگ دُور

کا جوبن ـــ سب خواب ہو گیا، اور اگلی بہار کی راہ ابھی سے دیکھنے کو فرشِ راہ ہو گیا۔ گرمی اور بڑھی، لُو اور چلی، رات کی خنکی بھی ہوا ہو گئی، تب ہمارے موتیے میں بہار آنے لگتی ہے۔

ایسی بہار کہ موتیے کے پودے اور جھاڑیاں سفید سفید نازک پھولوں سے، سرتا پاؤں لدنے لگے، خوشبو ایسی کہ دل کو لبھائے، اور موتیے کے پھولوں کی چاندنی ایسی کہ دل کو رومان سے تڑپائے کہ بنا موتیے کے ناں مرد کو چین آئے، اور نا عورت کو سکون ملے۔

موتیے کا حسن اور خوشبو سے فیض یاب ہونے اور اُس سے رومان کرنے کے لئے، انسان میں حسِ لطیف کا ہونا اشد ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ اگر کسی عورت یا مرد میں حسِ لطیف نہ ہو تو اُس کے لئے موتیا، محض ایک سفید سا، عام سا اور بیکار سا پھول ہے، بلکہ اِس حد تک بے مصرف پھول کہ جس کے ہار کا استعمال فقط رُوٹھی بیوی کو منانے کے لئے یا محبوبہ پر اپنی حسِ بے لطیف کی وقتی دھاک بٹھانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ یعنی کاروباری استعمال ـــ اِن ساعات کے بخیر و خوبی انجام پذیر ہو جانے کے بعد، موتیے کا زندگی میں عمل دخل قطعی بند شمار کیا جاتا ہے، مگر جن عورتوں، لڑکیوں یا مردوں کو موتیے کی خوشبو سے عشق اور موتیے کے پھول سے پیار ہوتا ہے، اُن کی زندگی میں گرمیوں کی موتیے کی بہار والی راتیں، موتیے کے بنا ادھورے عشق کی مانند ہوتی ہیں۔ ایسا عشق جس میں نہ جوانی کی مستی ہو، اور نہ خون کے بہاؤ کی گرمی ہو، یا یوں کہہ لو کہ جیسے ایک بوڑھے مرد سے جوان لڑکی کا بیاہ کر دیا گیا ہو، یا یوں بھی کہ نا آسودہ عورت کسی بے بہار کے مرد کی مردہ بانہوں میں ہو۔ موتیے کے عاشق بڑے طرح دار اور حسن کے دیوانے ہوتے ہیں، خواہ وہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتے ہوں یا صنفِ کرخت سے، اُن کی جسمانی اور رُوحانی آسودگی، موتیے کی خوشبو کی طرح لمس دار

ہوتی ہے۔ گویا موتیے کی خوشبو، مرد کی نفسیات میں جذبات اور عورت کی نفسیات میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے، جس سے آسودہ تحرک وجود میں آ کر مستی پیدا کرتا ہے۔

موتیے کی خوشبو انسانی رُوح میں ایک عجیب سا مرئی اور لازوال نازک احساس بیدار کرتی ہے۔ اِس کی خوشبو میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ گرمیوں میں تازگی اور بہار کا سماں بیدار کرتی ہے، جبکہ اِس خوشبو کو یعنی موتیے کے عطر کو اگر سردیوں میں سُونگھا اور لگایا جائے تو زہر لگتا ہے۔ گویا موتیے کی خوشبو صرف گرمیوں کی قدرتی اور رُوح پرور خوشبو ہے؛ جو رُوح میں آسودگی اور جسم میں گرمی سے پیدا ہونے والی حرارت کو اپنی خوشبویاتی لطیف احساس سے راحت و انبساط میں تبدیل کر دیتی ہے، موتیے کی خوشبو کا ادراک یوں تو ہر کس و ناقص کو ہو جاتا ہے مگر کہتے ہیں کہ عورت میں یہ لطیف اور رومانوی جذبات کو یکایک سطحِ عروج پر لے جاتی ہے، جس سے اُس کے بدن میں انگڑائی کی سی کیفیت خانخواہ جنم لیتی ہے، اور جس سے اُس میں لطیف جذبات بیدار ہو کر اُسے مستی کے گہرے سمندر میں بھی لے جاتے ہیں، تب آسودگی فقط موج کے ساحل پر ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب کرامات موتیے کی خوشبو کا محاصل ہیں، جس سے اِس کی خوشبو کی تاثیر کے رُوحانی اثرات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اور سُنیے ___ صنفِ نازک کا دعویٰ ہے کہ اُنہوں نے ڈھیروں ڈھیر موتیا، بالوں میں، کانوں اور کلائیوں میں پہنا ہوا ہو تو کسی بھی مرد کو دونوں طرح سے رجھانا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایک اُس کی خوشبو سے، اور دُوسرے اپنی خوبصورتی کو اُس کی خوبصورتی میں گوندھ کر ___ بس اگر آپ مرد ہیں تو محتاط رہیے گا اور اگر عورت ہیں تو تیار رہیے گا ___ !

اماوس کی اندھیری رات میں موتیے کے پھول چٹکی ہوئی چاندنی کی طرح

جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ عمل صرف اِس وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے کہ جب موتیے کی خوشبو آپ کی خوابیدہ بینائی کو بھی اپنے ہونے کا شدّت سے احساس دلاتی ہے۔ اندھیری رات میں کچھ نظر آئے یا نہ آئے؛ موتیے کا پھول صاف نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ آپ کی بینائی، اُس کی خوشبو کے تعقب میں جو جاتی ہے — ! اور اِس لئے بھی کہ اُس کی خوشبو اور پھول کی کنواری پاکیزگی، اندھیرے کے طلسم کو اپنی مستی سے خیرہ کردینے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ انسانی آنکھ جو اندھیرے میں کچھ نہیں دیکھ سکتی، فقط موتیے کے پھول کو دیکھنے پر قادر ہوتی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھئے، آپ اُس کے سحر میں یقیناً گرفتار ہو جائیں گے، اور ایک اَن ہونا رُومان آپ کی رُوح میں کروٹیں اور انگڑائیاں لینے لگے گا۔

سم

سم ایک قیامت کے اوصافِ حمیدہ رکھنے والی چیز ہے۔ انگوٹھے کے ناخن کے برابر اس کا سائز ہے اور عام سے باریک گتے جتنی موٹی ہوتی ہے۔ جب اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھو تو دُنیا کی سب سے بے ضرر اور ناکارہ شے نظر آتی ہے — ایک باریک پرت آدھا انچ ضرب آدھا انچ کی ہے، جس پر باریک کاغذ جیسے پیتل کی تہہ منڈھی ہوتی ہے۔ اس پیتل کی پرت پر ایک واضح نقشہ کسی فلیٹ یا جدید کوٹھی کا بنا ہوتا ہے، جس میں ایک ماسٹر بیڈ، ڈرائینگ ڈائینگ، کچن، برآمدہ اور ایک اور چھوٹا بیڈ رُوم تما سٹور واضح نظر آتا ہے۔ چھوٹے بیڈ رُوم کے ساتھ ایک معمولی سا باتھ رُوم

بھی ہوتا ہے، جس کا دروازہ کمرے میں مستقل کھلا نظر آتا ہے، ہر کمپنی اپنی سِم پر ذرا مختلف نقشہ بناتی ہے، باقی ہیت ترکیبی سب سموں کی ایک جیسی اور سائز بھی سو فیصد ایک جیسا ہوتا ہے۔ شاید اِن لوگوں نے آپس میں طے کیا ہوا ہے کہ بس نقشہ اپنا اپنا بنائیں گے، مگر پلاٹ کا سائز ایک ہی رکھیں گے۔!

اوصافِ حمیدہ ہر سِم کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وفاداراتنی زیادہ ہے کہ فقط اپنی کمپنی کا نام بولتی اور کہتی ہے۔ سِم کی وفاداری کی کوئی مثال دُنیا، اِس عالمِ انسانیت میں مجھے قطعی ممکن نظر نہیں آتی۔ جو کمپنی اِس کا میکہ ہے، بس اُسی کا نام جپتی ہے اور اُسی کے گن گاتی ہے۔ بے وفائی اور ہرجائیت کا قطعی کوئی تصور نہیں ہے، یہاں تک کہ جس کے دامِ اُلفت میں آجائے، فقط اُسی کی ہو جاتی ہے۔ سِم کا لفظ چونکہ ہمیں کسی بڑی سے بڑی ڈکشنری یہاں تک کہ قدیم ترین اُردو ڈکشنری فرہنگِ آصفیہ اور نہ ہی کسی جدید ترین لغت میں ملا، سو ہم نے خود ہی طے کر لیا کہ یہ صنفِ نازک اور ظرفِ مونث ہے۔ ہاں تو اِسی لئے ہم کہنا چاہتے ہیں کہ موصوفہ، عفیفہ کے نکاح کا اختیار فقط اُس کی مالکن (کمپنی) کو ہے۔ بس جس سے سِم صاحبہ کو پہلے دن بیاہ دیا، عمر بھر اُسی کے ساتھ رہے گی۔ اُس کا نام اپنے دماغ میں پوشیدہ اور پیام وسلام اپنے دل میں چھپا کے رکھتی ہے، بے وفائی کا کوئی تصور نہیں ہے، حسن سلوک کی دِل وجان سے خواہش مند ہوتی ہے۔ کوئی اپنے ناجائز قبضے میں لے لے تو اور بات ہے، یعنی یہ کہ سِم اپنے نکاح نامے میں ڈالا نام کبھی نہیں بدلتی، ہاں مزے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی دُوسرے کے تصرف میں چوری کی وجہ سے چلی جائے تو نام اور شوہریت پہلے والے کی ہی استعمال کرتی ہے، اور مزا نئے قابل مالک کو دیتی ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی سِم سے والہانہ عشق ہو جاتا ہے، اگر کوئی (چور) اُن کی سِم لے جائے تو فوراً (تھانے) اُس کے میکے

(کمپنی) کو بے دھڑک اطلاع دیتے ہیں۔ رپورٹ کا مقصد اُس کے حقوقِ استعمالِ زوجیت معطل کرانا ہوتا ہے، یہ معطلی عارضی ہوتی ہے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چور اُس کا ناجائز استعمالِ زوجیت نہیں کرسکتا، اور پھر جیسے ہی ایک آدھ دن میں حالات بہتر ہوتے ہیں سم کا اصل مالک کمپنی سے اُس کے حقوقِ زوجیت اپنے نام بحال کرالیتا ہے، اور پھر سے شب وروز اُس کے وصل میں نہایت محبت، اُلفت اور پیار کے ساتھ گزارنے لگتا ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، بلکہ مزید چند دن بعد اُسے احساس بھی نہیں رہتا کہ وہ کسی کے پاس چلی گئی تھی، بلکہ یوں سوچتا ہے کہ جیسے پاکیزہ گئی تھی، ویسی پاکیزہ آگئی ہے۔ بس اسی طرح کا احساس ہوتا ہے کہ وہ باعصمت اور باعفت تھی اور ہے ـــ!

دُوسری طرف سم بی بی میں یہ وصف بھی ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے مالک سے بے وفائی نہیں کرتی۔ پاک باز اور وفادار بی بی ہوتی ہے، اتنی کہ جو مالک بولے، وہی بولتی ہے، جو مالک کہے وہ کرتی ہے، جس سے رابطے کو کہو، اُس سے ملتی ہے، باقی کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔ کھانا پینا اُس کا بالکل عام بیویوں جیسا ہے، خرچہ روز مانگتی ہے، خرچہ پورا نہ کرو تو رُوٹھ کر ایسی چپ سادھ لیتی ہے کہ مجال ہے کہ ایک لفظ بھی بولے۔ گویا یہ نخرے کا نام ہوتا ہے ـــ اَب قرض لو، اُدھار لو، یا قرضِ حسنہ لے کر جب تک اُس کے نخرے کی نذر نہیں کرو گے، ہرگز نہ بولے گی، ایسی زبان بندی کرلے گی کہ کوئی چال کارگر نہ ہوگی ـــ فقط مال کے نذرانے سے راضی ہوگی، اُسے کوئی غرض نہیں کہ مال چوری کا ہے یا حلال کا ہے۔ اور جب آپ اس کی ذات پر مال نچھاور کردو گے تو فَر فَر بلکہ فَرفَر بولے گی۔ باقی دیگر اوصافِ حمیدہ، اس ذاتِ شریف کے بیان کرو تو کسی طرح ختم نہ ہوں۔

ہاں البتہ اور چند باتیں سم صاحب کے بارے میں اِس موقع پر مزید بتانا ضروری ہیں۔ وہ یہ کہ اِس کا حصول اُسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب تک آپ اِس کے

نکاح نامے یعنی معاہدہ مابین فریقین پر دستخط، نشان انگوٹھا اور اپنا ملک گیر شناختی نمبر درج و ثبت نہیں کرتے، یہ آپ کی زوجیت میں ہرگز نہیں آئے گی۔ اِس امر کو بجالانے کے لئے، اوّل شرط میں آپ کا بالغ ہونا بہت ضروری اَمر ہے، دُوسرے یہ کہ یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے، یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ پورے خاندان کے افراد کی بارات لے کر جاتے ہیں یا یہ نکاح آپ خاموشی سے اکیلے ہی فرما آتے ہیں۔ کہتے ہیں بلکہ مشہور ہے کہ اگر آپ قواعد و اصول نکاح بابت سِم پڑھ لیں تو ہرگز ہرگز اِس پاک باز بی بی کو اپنے تصرف نکاح میں لانا پسند نہیں کریں گے۔ حل اِس کا میکے (کمپنی) کے دانشوروں نے یہ نکالا ہے کہ شرائطِ نکاح اتنی باریک اور اندھی پھیکی روشنائی سے چھاپی ہیں کہ وقتِ دستخط معاہدہ نکاح، قطعی نہ پڑھا جا سکے۔ بس خوشی خوشی دستخط معہ نشان انگوٹھا ثبت کر دیں۔ بس گھر لاتے ہی دُلہن عفیفہ سِم بی بی بے باک ہو کر پیسے دھیلے کا مطالبہ داغ ڈالتی ہیں، اور پیسہ پیٹ میں جاتے ہی بے باک ہو کر بُو بُو، فر فر زبان قینچی کی طرح چلانے لگتی ہیں کہ مزا آ جاتا ہے۔

عفیفہ سِم بی بی کو تصرف میں لانے کے لئے ایک کڑی ترین شرط یہ ہے کہ اُس کے لئے گھر کا معقول بندوبست کر کے رکھیئے، چاہے وہ گھر اپنا ہو، مانگے کا ہو یا چوری کا ہو، گھر ہونا از حد ضروری ہوتا ہے۔ عفیفہ مسماۃ سِم بی بی کا گھر موبائل شریف ہوتا ہے۔ غریب آدمی بیاہ کر لائے تو معمولی سے ہزار دو ہزار کے گھر میں اُس کو رکھتا ہے، اگر دُولہا میاں درمیانے طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو اِس عفیفہ کو آٹھ، دس ہزار کا گھر فراہم کرتا ہے، اور اگر صاحب حیثیت ہو تو اِس نیک بی بی کو چالیس، پچاس ہزار کے گھر میں بیاہ کر لاتا ہے، جس میں وہ مزے مزے کے کرتب دکھا سکتی ہے۔ گویا ساری دُنیا کو اپنی اُنگلیوں پر نچانے کی قوت سے مالا مال ہو جاتی ہے۔ یعنی عفیفہ سِم کا نصیب

ہے کہ وہ بعد از نکاحِ مسنونہ کسی غریب کے گھر جاتی ہے یا کسی امیر کے۔

اِس کے دو مزید وصف نہایت قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ عام گھریلو بیوی کی طرح اِس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا، دُوسرے یہ کہ بندہ دُنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، یہ اُسے رقیب رُوسیاہ کی طرح تلاش کر دیتی ہے ــــ تفصیل اِس اجمال کی یوں بیان کی جاتی ہے کہ آپ بس اُس کو بندے کا اسم نمبر بتاؤ یعنی بندے کی عفیفہ پاک باز کا نمبر بتاؤ ــــ بس اُس کا دل راضی اور پیٹ بھرا ہوا ہو تو دُنیا کے جس کونے میں بھی ہوگا کہ ابھی آپ دو پلکیں بھی نہ جھپکو گے تو یہ رابطہ کر دے گی۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اُس بندے کے پاس بھی بی بی (سم) ہو، یعنی ڈھونڈنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، خواہ کوئی دُوسری عفیفہ اُس کی برادری (نیٹ ورک) کی ہو نہ ہو، یہ اُسے دُنیا کے ہر کونے سے ڈھونڈ نکالے گی، بالکل اُسی طرح ہے کہ جیسے آپ ایک بی بی کے ہوتے ہوئے کسی دُوسری بی بی سے ذرا سی چاہ کی نظر سے دیکھیں تو وہ بھانپ جاتی ہے۔ بالکل اِسی طرح یہ عفیفہ نیک اطوار یہ عمل بجا لانے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ پھر جس طرح گھر کی بی بی کا نشانہ خطا نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح اِس عفیفہ کا نشانہ بھی قیامت کا ظالم ہوتا ہے۔ چاہے وقت دن کا ہو یا رات کا، یہ محترمہ دھڑلے سے جا کر دروازہ کھٹکھٹا دیتی ہے، اور گھنٹی بھی ساتھ میں بجاتی چلی جاتی ہے۔

یادداشت اِس عفیفہ کی کمال ہوتی ہے، جس طرح عورت کوئی بات نہیں بھولتی، اُسی طرح یہ بھی کچھ نہیں بھولتی۔ میکے والے (کمپنی) اِس کی خاص نگرانی اور باخبری رکھتے ہیں، یا یوں کہہ لو کہ آپ کے تصرفِ نکاح میں آجانے کے بعد یہ کسی صورت، پردہ اور در پردہ اپنے میکے (کمپنی) سے رابطہ منقطع نہیں کرتی۔ آپ معصوم جان یہ سمجھتے ہیں کہ اَب یہ بے بس سی جان آپ کے قبضۂ قدرت میں آگئی ہے، اَب

جو چاہے کرتے پھرو، یہ چوں نہیں کرے گی، اور نہ ہی کسی کو خبر دے گی، گویا یہ باخبر رکھنے سے محروم ہو چکی ہے۔ مگر ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے، اُس کے میکے میں آپ کی ہر بات کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے، خواہ آپ سو فیصد بھول بھال چکے ہوں، اِس وصف کی بات پر اَب دُنیا کی عدالتیں، اِس کی گواہی کو سو آدمی کی گواہی پر بھاری سمجھتی ہیں۔

پیغام رسانی میں بھی اِس کا جواب نہیں ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے جہاں دو عورتیں چند منٹ کو ملیں، خواہ واقف ہوں یا ناواقف، متاد لُخیال کر کے کُل معلومات، چند منٹ میں اِدھر سے اُدھر کر دینے پر قادر ہوتی ہیں، بالکل اُسی طرح یہ عفیفہ بھی ہیں۔ بس چند سیکنڈ میں اِدھر کی بات اُدھر کر دیتی ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جب سے یہ آئی ہے، عشق کا کاروبار آسان سے آسان تر ہو گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں، جب ہم عشق فرماتے تھے، ہمارا پہلا، دُوسرا نہیں تو تیسرا خط، جو معشوق کے حضور لکھا جاتا تھا، پکڑا جاتا تھا، اور رُسوائی بھی ہوتی تھی، ناں ابا معاف کرتے تھے، نہ معشوقہ کے گھر والے، بلکہ اہلِ محلہ بھی کارِ عشق میں خواہ مخواہ کے روڑے اٹکاتے تھے، اور یوں کبھی کبھی ہر حال میں محبوبہ سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا —— وہ تکیے میں منہ چھپا چھپا کر روتی تھی، اور ہم داڑھی بڑھا کر سوگِ عشق مناتے نہ تھکتے تھے: مگر اَب، اَب تو ساتھ لیٹے اماں، ابا کو خبر نہیں ہوتی اور عشق عالمِ بالا میں محفوظ طریقے سے محوِ پرواز ہوتا ہے ——

اَب جن عاشق و معشوقہ کے پاس ذرا اچھے قسم کے آلات (موبائل) ہیں وہ تو بذریعہ ہوائی تار برقی بذریعہ تصویر ساکت و متحرک، عشق کرتے ہیں۔ مثلاً مختصر خط آیا (خوبی جس کی یہ ہے کہ کسی ڈاکیے کی ضرورت نہیں) کہ آج میں نے تمہاری پسند کے کپڑے اور چوڑیاں پہنی ہیں —— محبوب کہتا ہے، میری جان ذرا ہمیں بھی تو دکھاؤ —— جھٹ سے ذرا دیر میں تصویر ساکت رنگین آتی ہے، معشوق کا دل باغ باغ

ہو جاتا ہے ــــ معشوقہ پیغام بھیجتی ہے کہ سیاں ــــ وہ شرٹ تم نے پہنی جو کل میں نے تم کو راہ چلتے پکڑائی تھی؟ ــــ وہ کہتا ہے ــــ ابھی پہن کر دکھاتا ہوں تم کو ــــ چند منٹ بعد ایک تصویر موصول ہوتی ہے، جس میں معشوق دیوار کے ساتھ کھڑا، اُسی شرٹ میں ملبوس ہوتا ہے ــــ محبوبہ خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہے ــــ پیغام آتا ہے کہ تم کیا کر رہی ہو، بہت دیر سے تم نے کوئی تحریر محبت نہیں بھیجی ــــ وہ کہتی ہے، میں ابھی نہا کر نکلی ہوں اور تمہاری پسند کے اپنے لمبے بال سکھا رہی ہوں ــــ جواب آتا ہے ــــ ہائے تم کتنی پیاری لگ رہی ہو گی، بھیگے بھیگے بالوں میں ــــ چند منٹ کے اندر اندر ایک مختصر ویڈیو فلم موصول ہوتی ہے، جس میں محبوبہ دل نواز، آئینے کے سامنے کھڑی، نیم عریاں حالت میں، اپنے بالوں سے والہانہ انداز میں کھیل کھیل کر جھٹک رہی ہوتی ہے، اور ایک قاتلانہ مسکراہٹ سے آئینہ کی طرف نہیں بلکہ نادیدہ محبوب کی طرف دیکھ رہی ہوتی ہے ــــ حضرات بس ــــ اِس سے آگے جانے کی اجازت، مجھے میرا ماضی نہیں دیتا ــــ کہاں ہمارے عشق، کہ تانگے میں اسکول سے آتے جاتے، بُرقعے کی اُوٹ سے ایک جھلک دیکھ کر ہفتے گزار دینا، اور کہاں یہ عشق کہ لمحے لمحے کی خبر معہ تصویری جھلکیاں، جوق در جوق، ارجنٹ ہاٹ نیوز کی طرح آ، اور جا رہی ہیں ــــ بس ہمارا زمانہ بیت گیا؛ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، آج کے عشاق اور معشوقائیں، عالم بالا میں محوِ سفر ہیں، اور عفیفہ پاکیزہ سم بی بی، اُن کے رازہائے درونِ خانہ سے خرمستیاں کر رہی ہے، پر بولتی نہیں۔ وجہ یہ کہ ایک بٹن صفائی ستھرائی کا جو ہے، پلک جھپکتے میں سب ایسے صاف کر دیتا ہے کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے، نہ پکڑ سکتے ہو، نہ الزام دھر سکتے ہو ــــ اِسی لئے آج کے عاشق اور معشوقائیں نیک اور پارسا ہیں؛ ہم گناہ گار ہیں کہ ہمارے خط کبھی پکڑے گئے تھے ــــ!

مار نہیں پیار

مجھے تو یہ کسی دشمنِ تعلیم (سیاست دان) کا مضحکہ خیز مفروضہ لگا ہے، جو ہمارے معاشرے کو اِس پیار کے ہتھیار سے ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ دُنیا میں بہت سے کام پیار سے ہو جاتے ہیں، اور بہت سے کام ڈانٹ پھٹکار اور مار سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ـــــ اب ذرا یوں غور فرمائیں کہ "لاتوں کے بھوتوں کو پیار سے منوایئے" ـــــ میرا نیا محاورہ پڑھ کر آپ کو خواہ مخواہ ہنسی آسکتی ہے۔ مگر افسوس کہ مار نہیں پیار کا فارمولا پڑھ کر کسی کو نہ ہنسی آئی، نہ افسوس ہوا۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ

اِس حد تک مزاحیہ باتیں سن کر بعض مرتبہ ہنسی نہیں رونا آنے لگتا ہے۔

اگر ہم لاتوں کے متوالوں کو بھی پیار سے سمجھانے لگیں تو کس حد تک سمجھا سکتے ہیں۔ ذرا اِس مسئلے پر بھی غور کرتے ہیں — ایسا لگتا ہے کہ کوئی احمق الحمق ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ زچ کرنے والے سے زچ نہ ہو بلکہ اُس کو زچ کرنے پر مزید پیار کرو، یہاں تک کہ وہ آپ کا ریاضی کا فلسفہ اور کلیہ سمجھ جائے، جو طالب علم گھر کا کام گھر سے نہ کر کے لائے اور روز اِس وطیرے کا ورد جاری رکھے، آپ اُس کو اور زیادہ پیار سے سمجھائیں کہ بیٹا تم پورے آٹھ ماہ اور دس دن سے یہی کر رہے ہو! میں روزانہ تمہیں بحکم سرکار و عالی مقام افسرانِ سرکار، پیار سے سمجھاتا ہوں کہ گھر کا کام، گھر سے کر کے اسکول لایا کرو، تم نہیں کرتے، میں اَب اپنے آپ کو تمہارے سامنے پاگل ابنِ پاگل سمجھنے لگا ہوں — اگر میں تم کو پھٹکار دوں، ڈانٹ دوں یا پاگل ہو کر ایک ہلکا سا تھپڑ تمہارے گال کی بجائے سر پر لگا دوں؛ تو تمہاری شیطانی مسکراہٹ بتاتی ہے کہ تم یہی تو مجھ سے چاہتے ہو کہ میں بے بس، لاچار اور پاگل ہو کر یہ عمل بجا لاؤں۔ تمہاری آنکھوں میں اِسی سیاست کی طلب مجھے نظر آتی ہے، یعنی یہ کہ میں کسی طرح پیار کا روزہ توڑ دوں تو تم مجھے نبٹ لو — میڈیا کو بلاؤ، افسروں کو فون کرو کہ جن کے نمبر مار نہیں پیار کے فارمولے کے نیچے جلی حروف میں لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ میرا اینڈ بج جائے، نوکری سے نکالا جاؤں کہ میں تو تشدد کرتا ہوں۔ کیونکہ تمہارے ہاں اور تمہارے مفروضے تراشوں کے یہاں پولیس تشدد نہیں کرتی، اُستاد کرتا ہے۔ سو میں نے اِس کا حل یہ نکالا ہے کہ تم کو کچھ نہ کہا جائے، جو تم کر رہے ہو تم کو احسن طریقے سے کرنے دیا جائے، یہاں اِس وقت تم جو کنواں بذریعہ پیار میرے لئے کھود رہے ہو، ایک دن خود اُس میں گرو گے اور ایسا گرو گے کہ تمہاری نسلیں تمہیں نہیں نکال سکیں گیں۔ بات یہ ہے کہ میں تمہیں نہیں مار سکتا، کیونکہ میں اپنی ننھی مُنی سی نوکری تمہارے

پیار میں قربان نہیں کر سکتا، میں بس نوکری بچانے پر رکھا گیا ہوں، جس کو بچانے پر دن رات لگا ہوں ـــــ مار نہیں پیار کے بعد تم جیسوں کے لئے مستقبل کے روشن ہو جانے کی چھوٹی سی اُمید بھی ختم ہو گئی ہے۔ پہلے ہم تمہیں ڈانٹ، مار اور ڈراوے سے کچھ نہ کچھ سکھا کر کارآمد شہری بنا دیتے تھے، مگر اَب ہمارے ہاتھ پاؤں پیار نے باندھ دیئے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ پیار کے فارمولے نے تم جیسے نالائق، پاجی اور بے ڈھب طالب علموں کو مزید گمراہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ ہماری بلا سے، پڑھو نہ پڑھو، کچھ بنو یا نہ بنو، سیکھو نہ سیکھو ـــــ ایک تھپڑ کبھی تمہیں بہت کچھ سکھا دیا کرتا تھا، اَب ہمیں سکھانے کو تیار بیٹھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے جن کو حکومت سے نوازا ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم پیار ہی پیار میں جاہل، گنوار، اجڈ اور بے ہنر رہ جاؤ۔ اُن کے کامے نہ بنو، کامے نہ بن سکو تو اُن کے ڈرائیور، چپڑاسی، کلرک یا زرخرید بدمعاش بن جاؤ۔ آخر اُن کو بھی تو حکومت اور افسری کرنے کے لئے مارے بھاگے اور پیار کے مارے نوجوانوں کی کثیر تعداد میں اشد ضرورت ہے ـــــ جو اُن کی خدمت پیار سے کر سکیں ـــــ بیٹا یاد رکھنا! جب وہ سہانہ وقت آئے گا تو وہ تمہیں دیوانوں اور غلاموں کی طرح مارا کریں گے اور تم اُن کے آگے اُف نہ کر سکو گے۔ اصل میں وہ چاہتے ہیں کہ تم پیار کی ترنگ میں کبھی نہ پڑھو، اور پیار کے نشے میں، پڑھائی کا سارا وقت اور عمر گزار دو، جب جوانی میں قدم رکھو تو تمہارے ہاتھ خالی ہوں۔

بیٹا ـــــ میں ساری جماعت کو خلوص نیت سے پڑھانا چاہتا ہوں۔ ماضی گواہ ہے کہ بہت سے بچے، میری مار سے افسر بن گئے، کئی چوری چکاری سے سدھر گئے، کئی سوجھ بوجھ پا گئے، کئی بچوں نے بُری عادتیں چھوڑ دیں، کئی بچے مار کے خوف سے فیل ہوتے ہوتے پاس ہو گئے، کئی بچے بُرے تھے جو اچھے بن گئے، کئی بچے گھر کے ماحول اور ماں باپ کے بلا وجہ لاڈ پیار سے بُرے راستے پر تھے، وہ مار اور سرزش کی دھمکی سے قابل ترین ہو گئے،

کئی بچے نالائقی چھوڑ کر عزت سے کے دربار میں آ گئے ___ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ کتنے بچے اُستاد کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار سے ڈاکو بن گئے؟ اُستاد کی مار سے کتنے بچوں نے چوری چکاری کو اپنا پیشہ بنایا ___ ؟ کتنے بچوں نے کم تولنا سیکھا؟ کتنے بچوں نے حق غصب کرنے کو اچھا جانا؟ کتنے بچوں نے والد بن کر اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا؟ ___ اُستاد کی مار بھی پیار کی مار ہوتی ہے ___ وہ اِس لئے نہیں مارتا کہ وہ تم سے دشمنی یا بغض رکھتا ہے، بلکہ وہ تمہیں اُس وقت مارتا ہے یا مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ جب تم غلط راہ پر جاتے ہو، اور سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے۔ پہلے وہ سخت سست لفظوں میں تمہاری گوشمالی کرتا ہے، بار بار وارننگ دیتا ہے، جب تم کسی بات پر کان نہیں دھرتے اور ہاتھ سے نکلے جاتے ہو اور اُستاد کی عظمت کو اپنے طریقے سے للکارتے ہو تو وہ تمہیں آئندہ زندگی میں رُسوائی سے بچانے کے لئے تم پر سوٹی یا ہاتھ اُٹھاتا ہے، اُسے تم کو مار کر قطعی خوشی نہیں ہوتی، وہ رات کو جب سوچتا ہے کہ اس نے کس بچے کو کیوں مارا، اور کتنا مارا، تو اُس کا ضمیر اُسے سونے نہیں دیتا، مگر یہ اُس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ ناجائز مار پیٹ کرتا ہے ___ ناجائز مار پیٹ کرنیوالا اُستاد ہو ہی نہیں سکتا، وہ تو اُستاد کی قابلِ احترام کرسی کے لائق ہی نہیں ہے۔

سو یہ بات طے ہے کہ تم اپنی نالائقی، لاپرواہی اور پڑھائی میں عدم دلچسپی ثابت کر کے ایک ہمدرد اُستاد کو خواہ مخواہ مارنے پر مجبور کرتے ہو، ورنہ وہ کبھی تمہیں نہ مارے ___ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اِن نالائق بچوں کے والدین خود اپنے لاڈ پیار میں اپنے بچے کو خراب کر کے اسکول بھیجتے ہیں، اور اپنی گھریلو نالائقی، نااہلی اور گندی تربیت کا بوجھ، بچے کے ذریعے اُستاد پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اُن کو خود دلچسپی نہیں ہوتی کہ اُن کا بچہ لائق آدمی اور اعلیٰ ظرف کا انسان بنے، وہ بچے کو اسکول بھیج کر اپنی باقی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو فارغ محسوس کرتے ہیں، اور بعض

والدین بچوں کو صرف اس لئے اسکول بھیجتے ہیں کہ اُن کی اذیتوں سے کچھ وقت کے لئے نجات پا سکیں۔ ایسے میں سارا غلبہ اور غصہ اُستاد پر نہیں نکلے گا، تو کس پر نکلے گا۔ ایسے والدین بچے کو پیار سے کچھ نہیں سمجھاتے، بس سمجھتے ہیں کہ اَب سارا پیار اُستاد ہی دے گا، وہی تعلیم و تربیت کرے گا، اور بچہ عظیم انسان بن جائے گا۔ ایسے بچے عظیم انسان نہیں بلکہ معاشرے اور گھر کا ناقابلِ برداشت بوجھ بنا کرتے ہیں۔

ذرا یہ تو بتا نا کہ اُستاد کسی ہونہار، سمجھدار، لائق اور تابع دار بچے کو کبھی مارتے دیکھے گئے ہیں۔ ظالم سے ظالم اُستاد بھی ایسا نہیں کرتا پایا گیا — اس کا جواب یقیناً نہیں میں ہے — اَب سوچو کیوں نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ اسکول، جس مقصد کے لئے آتے ہیں، اُسے کم و کاست اپنی بساط کے مطابق پورا کر رہے ہیں۔ ایسے بچوں کو نہ کبھی مار پڑتی ہے اور نہ ہی مار کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ہی اِن بچوں کو کسی خاص پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔

اصل میں نئی نسل کے دُشمن یہ چاہتے ہیں کہ اِس قوم کی نسل کو جس طرح ہو سکے، خراب کر دیا جائے، اور اِس خرابی اور بربادی کی بنیاد کیوں نہ اسکول کی سطح پر رکھ دی جائے۔ اِس بربادی کے لئے اچھے لفظوں کا سہارا لیا جائے، اُساتذہ کو اعصابی اور ذہنی دباؤ کا شکار کر کے نوکری بچانے پر لگا دیا جائے، بچوں اور والدین کو شیری دی جائے تاکہ جائز کو ناجائز، اور ناجائز کو جائز بنانا آسان ہو جائے۔ جب اِس عمل سے گزر کر یہ نسل پچیس سال بعد زندگی کے عملی میدان میں آئے گی تو جانور سے بھی بدتر حالت میں ہوگی۔

آئیں — ذرا پیار اور مار کے اِس ملک گیر نظریئے کا نفسیاتی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ مار کا درجہ، معاشرے میں قانون کے اطلاق کے لئے استعمال ہوتا ہے — مار وہاں پڑتی ہے، جہاں قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہو، اور پیار وہاں ملتا ہے، جہاں قانون، اخلاقیات اور معاشرے کی سربلندی کو سراہا جا رہا ہو۔ اگر

ہم اِس چھوٹی سی بات کو سمجھ لیں تو پیار اور مار کا اسکول میں تصور کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اسکول کے بھی کچھ قوانین ہوتے ہیں، جن کو اسکول کی انتظامیہ اور اساتذہ مل کر، بچوں کی اعلیٰ تربیت اور بود و باش کے لئے چلاتے ہیں تاکہ بچوں کی ایسی عملی تربیت ہو سکے کہ وہ معاشرے کے مفید اور قابلِ احترام لوگ بن سکیں، جس سے معاشرے میں خوبصورت اقدار تشکیل پاتی ہیں — جو بچے اپنی گھریلو تربیت، اپنی ازلی بدفطرتی اور ناقص عقل کے سبب قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اُن کی گوشمالی، اسکول کی تمام انتظامیہ پر فرض بن کر لاگو ہوتی ہے، اِن بچوں کو قانون شکنی پر روکنا ٹوکنا ضروری ہے۔ ایسے بچوں کو اگر پیار ہی پیار دیا جائے تو معاشرہ دھماکے سے پھٹ جایا کرتا ہے۔ کیا ہم ایسا کرنے تو نہیں جا رہے؟ یہ ہے وہ سوال جس نے مجھے یہ سب لکھنے اور کہنے پر مجبور کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اِن قانون شکن بچوں کو اسکول کی سطح پر دہشت گردی کی تربیت، پیار کے آڑ میں دے رہے ہیں، اور خود اِس وقت پیار کی افیون کی گولی کھا کر سکون کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

بس آخری بات یہ ہے کہ اگر قانون شکنی کو پیار سے سمیٹا اور سنوارا جا سکتا ہے تو میں درخواست کروں گا کہ ہر تھانے کے باہر بورڈ لگا دیا جائے کہ کسی ملزم اور قانون شکن کو مارا نہیں جاتا، پیار سے سمجھایا جاتا ہے۔ عدالتیں ملزمان کو سزا نہ دیا کریں، بلکہ معاشرے کو حکم دیا کریں کہ اس قاتل یا دہشت گرد سے پیار کرو، تاکہ آئندہ یہ پیار کے نشے میں ایسا نہ کرے۔ کوئی محکمہ قانون کی خلاف ورزی اور افسر کو زچ کرنے پر سزا نہ دیا کرے بلکہ پیار دیا کرے، اِس لئے کہ یہ چور، ڈاکو، قاتل، لٹیرے، دہشت گرد اور قانون کی دھجیاں اُڑانے والے، ایسے اسکولوں سے پڑھ کر آئے ہیں کہ جہاں اسکول کا قانون توڑنے پر کوئی سزا نہیں تھی۔ یہ مار سے نہیں، پیار سے قانون شکن بنے ہیں — !

فیری میڈوز کا خواب

میں متواتر ایک کشش و پنج میں ہوں۔ سفر کسی طرح ختم نہیں ہو رہا۔ کبھی سوتا ہوں، کبھی جاگتا ہوں —— جب آنکھ کھلتی ہے تو باہر جھانکتا ہوں۔ دریائے سندھ میری بس کے ساتھ چل رہا ہے، بس فرق صرف اتنا ہے کہ جس سمت سے سندھ کا پانی آ رہا ہے، میری بس اُس سمت میں کبھی تیز، کبھی آہستہ جا رہی ہے، پانی اُس سمت میں بہہ رہا ہے کہ جو سمت میری بس کی پشت پر ہے اور پیچھے رہ جاتی ہے۔ دوپہر کی تیز دھوپ ہے، گرمی بہت ہے، جو بس کے اندر تک آ رہی ہے۔ جن پہاڑوں کے ساتھ ساتھ بس چل رہی ہے، وہ مجھے بہت خوفناک لگ رہے ہیں، اُن کی زردی، مردار جیسی

ہے، کبھی وہ میری بس پر جھک جاتے ہیں، اور کبھی بس اُن پہاڑوں کی طرف، کسی موڑ پر ایسا چکر کھاتی ہے کہ لگتا ہے کہ اُن زرد پہاڑوں میں ہی گھس جائے گی۔ میں تھک گیا ہوں، مجھے لگ رہا ہے کہ میں دوبارہ سو جاؤں گا، اور بس چلتی رہے گی، اور میں پھر سوتا جاتا ہوں۔

یہ ایک خواب ہے، جو مجھے مسلسل جگا رہا ہے۔
ایک نیند ہے، جو مسلسل آ رہی ہے۔
دماغ جاگ رہا ہے اور میں گہری نیند سو رہا ہوں۔
میں سوتے میں جاگ کر فیری میڈو کا خواب دیکھ رہا ہوں۔
آپ یقین مانیں
میں سینکڑوں سال سے فیری میڈو کے خواب میں ہوں۔
جو میں نے
سنا ہے، پڑھا ہے، اور تصویروں میں دیکھا ہے ـــــ !

فیری میڈو کا خواب برسوں سے میرے اندر پنپ رہا ہے، اور زندگی میں جب بھی میں نے وہاں جانے کے بارے میں سوچا ہے، رکاوٹوں نے راستہ بند کر دیا ہے۔ شاید وہ پریاں جو اُن دُور افتادہ جنگل کی باسی ہیں، مجھے وہاں آنے سے روک دیتی ہیں۔ اُن کو پتہ چل جاتا ہے کہ میں اُن کے حسین دیس آنے کے لئے پَر تولنے لگا ہوں، تو وہ اپنے غیبی علم کی بدولت یہ جان کر ایسی ایسی دیدہ نہ دیدہ رکاوٹیں، میری زندگی کے دھارے میں کھڑی کر دیتی ہیں کہ میں وہاں جاتے جاتے، نہ جانے کا فیصلہ کر دیتا ہوں۔ مگر جب میں ایسا کرتا ہوں تو میں بلا مبالغہ حالتِ خواب میں چلا جاتا ہوں، اور جب آدمی حالتِ خواب میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ کہیں بھی کسی بھی جگہ حاضر

ہو جانے کی ماورائی قوت سے مالا مال ہو جاتا ہے ___ بس میں حالت خواب میں ہوں کہ میری قوت اِدراک ماورائیت سے ہمکنار ہے۔

میں گرمی سے کسمسا رہا ہوں ___ کہ شوروغوغا بلند ہوا ہے کہ دریائے سندھ پر رائے کوٹ کا پل آگیا ہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے بہار کی آمد کی اطلاع دی ہو، شاید صبح صبح کا ملگجہ اندھیرا، سفیدی میں اُجالا جا رہا ہے۔ میں سندھ کی بپھری موجوں کو دیکھ رہا ہوں، اُس کے پانی کی سبزی میرے اندر اُترتی جا رہی ہے، جیسے کسی دلنوازی حسینہ کی سبز آنکھوں نے میری سیاہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی ہوں، اور میں بتدریج اُس کی آنکھ کے پانی کے حسن کے رعب اور دبدبے میں جکڑا جا رہا ہوں۔ اُس کے سبزی مائل پانی کے سحر میں گرفتار ہوتا جا رہا ہوں۔ میں اُس کے کنارے کھڑا ہوں، مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ وہ چکر کھاتا، اُچھلتا اور متواتر بہاؤ دار پانی، مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے، میری رُوح خوانخواہ اُس کی تازگی کو چھونا اور محسوس کرنا چاہتی ہے، وہ مجھے اپنی طرف پوری مستی سے بلا رہا ہے، اور میں اُس کی مستی سے ہمکنار ہونے کے لئے بے چین ہوں۔ اِس سے پہلے کہ میں اُس کی مستی میں پوری گہرائی تک مست ہو جاتا، مجھے کوئی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، میرے اندر کا زندہ آدمی جاگ جاتا ہے، میں اُس حسینہ کی سبز آنکھوں کے سحر سے جھٹک دیا جاتا ہوں اور زندگی کے اُسی پرانے دھارے میں واپس آجاتا ہوں۔

وہ پریوں کا دیس ہے کہ جس کو دیکھنے اور جس میں جھانکنے کی مجھے آرزو ہے، جس کی انہونی کشش مجھے اُس کی طرف دھکیلتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بہت سے خواب اَدھورے ہی اچھے لگتے ہیں۔ شاید یہ بھی اُنہی خوابوں میں سے ایک ہے۔ اَدھورا اور ازلی خواب ___ جس کے ٹوٹ جانے کا خوف مجھے اِس طرح سے ہے کہ اگر میں

فیری میڈ وچ مچ پہنچ گیا تو میرا خواب ٹوٹ جائے گا، اور پھر کبھی یہ خواب نہ آئے گا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر نیند سے خواب گم ہو جائیں تو زندگی کا نشہ بے کیف ہو جاتا ہے۔ کچھ نہ ملے تو خواب، رُوح کی تڑپ کو دو چند کرتے رہتے ہیں، اور جب کبھی تعبیر خواب مل جاتی ہے تو خواب بے کیف، بے لذت اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ بے لذت اور بے کیف خواب سے بیگانہ نیند، فقط ایک جسمانی تقاضہ ہوتی ہے، اُس کا رُوح کی اضطرابیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا — بے معنی اور مضحکہ خیز، جامد اور ناقص نیند — جس کے پورے ہونے کے بعد آپ کے پاس کچھ بھی سوچنے، حظ اُٹھانے اور بیان کرنے کو نہیں رہتا۔ گویا سب کچھ میکانکی اور جامد سا ہو جاتا ہے۔

کوچ نے واسو کا رومانوی شیروں والا پل، دھیرے دھیرے پار کیا۔ پھر رائے کوٹ آ گیا۔ میں جیپ میں اُڑ دھنس کر بیٹھ گیا ہوں۔ میں تنگی محسوس کر رہا ہوں؛ جیسے کوئی مجھے دونوں اطراف سے دبا رہا ہے، ایک طرف ایک بکری ہے، اور دُوسری طرف ایک موٹا سا آدمی ہے، مگر میں خوش ہوں، سنگلاخ پہاڑ پر چڑھتی، پتھروں پر اُچھلتی کودتی جیپ اُوپر کو آہستہ آہستہ، بل کھاتی پگڈنڈی نما سڑک پر چلی جا رہی ہے۔ دُھوپ بہت تیز لگ رہی ہے، پیاس سے میرے حلق میں اَب کانٹے پڑنا شروع ہو گئے ہیں، مگر مجھے میرے پانی کی بوتل نہیں مل رہی، میں دو چیزوں کے درمیان کستا ہوا ہوں، مجھے بہت شدید پیاس لگ رہی ہے، اور پانی کی بوتل سیٹ کے نیچے کہیں گم ہو گئی ہے، میں اس کسمساہٹ کے عالم میں اپنا ہاتھ سیٹ کے نیچے ڈال کر پانی کی بوتل ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے ہاتھ میں بکری کے تھن آ جاتے ہیں، مگر پانی نہیں ملتا، بکری جھنجھلا کر مجھے اور دبانے لگتی ہے، میری دُوسری پسلی میں موٹے آدمی کی کہنی چبھ رہی ہے، جس کی چبھن نے مجھے مزید بے حال کر دیا ہے، مگر میں برداشت

کر رہا ہوں۔ جیپ اَب اور اُوپر ایک نئے پہاڑ پر موڑ کاٹ کر چڑھ رہی ہے، اُس کا انجن بالکل بے بس ہے، اور اُوپر چڑھنے کو ہونک رہا ہے۔ یہ آواز بالکل ویسی ہی ہے، جیسی میرے گھر کی گلی میں موٹر ورکشاپ سے آتی ہے۔ خاص طور پر جب میں گہری نیند سو رہا ہوتا ہوں اور مستری ورکشاپ میں کسی ناکارہ گاڑی کا انجن بار بار سلف مار کر اسٹارٹ کرتا ہے، تب میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں ــــ مگر میں تو فیری میڈو کی طرف جا رہا ہوں۔ مستری اور پرانی گاڑی کا ناکارہ انجن اِس اچھوتے منظر کے سفر میں کہاں سے ٹپک پڑا ــــ پہاڑ اور سنگلاخ ہو گئے ہیں، جیپ لمحہ بہ لمحہ اُوپر کو چڑھ رہی ہے، سخت لُو ہے، بالکل ویسی لُو جیسی بجلی بند ہو جانے کے بعد، میرے کمرے کی کھڑکی سے آتی ہے، اور میں پسینے میں شرابور، کروٹ لینا بھی عذاب سمجھتا ہوں۔ شاید وہاں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے، کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اِن پہاڑوں کے کسی موڑ یا درّے سے آ کر مجھے نہیں لگتا۔ اَب جیپ بار بار تیزی سے موڑ کاٹتی، لق و دق پہاڑی صحرا میں چلی جا رہی ہے۔ بکری بار بار مَیں مَیں کرتی ہے، بالکل اُسی طرح جیسے سامنے والی خالہ کی بکری راگ آلاپتی ہے۔ موٹا آدمی اتنی زور زور سے سانس لے رہا ہے، جیسے کوئی اُس کا گلا دبا رہا ہو۔

نیچے تاتو نالہ بہہ رہا ہے۔ جس کا شور کبھی مدہم ہو جاتا ہے، اور کبھی تیز۔ بالکل جیسے میری گلی کے پچھواڑے، لکڑی کا آرا چلنے کی آواز ہوتی ہے، جو مجھے گہری نیند میں بعض مرتبہ لوری اور بعض مرتبہ انتہائی ناگواری پیدا کرتی ہے۔ تاتو نالے کا شور ایسا ہی ہے، کبھی کم، کبھی زیادہ، کبھی واضح اور کبھی کم۔ حالانکہ تاتو نالہ اِس جیپ ٹریک سے کہیں زیادہ نیچے بہہ رہا ہے۔ جب گرم ہوا کا جھونکا دُور نیچے تاتو نالے کی طرف سے آتا ہے تو آگ کے بگولے کی طرح گرم ہوتا ہے، اُس میں گندھک کی بُو اور

دھانس بھی ہوتی ہے، بالکل ویسی بُو جیسی ہمارے گھر کی گلی میں کسی شادی کے موقع پر انار چلانے سے نکل کر فضا میں پھیلتی ہے۔ یہ ابھی کل پرسوں کی بات ہے کہ ملک صاحب نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر اتنے انار چلائے کہ دو دن تک اُن اناروں کی گندھک کی بُو، گھر کی ہر شے سے آتی رہی، وہ بُو بستر اور تکیے سے یوں آتی جیسے اُن کو اناروں کی دُھونی دی گئی ہو، یا ایسا لگا کہ جیسے ہماری ناک میں اعلیٰ قسم کے انار چلائے گئے ہوں —— تاتو نالے کا پانی گرم انگارہ ہوتا ہے، اُس نالے میں کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا۔ کہتے ہیں کہ اُس کا پانی اتنا گرم اور بھاپ اُڑاتا ہے کہ پرندے اُس پر پرواز نہیں کرتے، بندہ اُس میں گر جائے تو چند منٹ میں بھنے ہوئے قیمے میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور اُس کا خون، چند سیکنڈ میں بھاپ بن کر تاتو کے پہاڑی ریگزار کی گرم ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے —— خدا خدا کر کے ایک پل آیا —— تاتو نالے کا پل، مخدوش لکڑی، بھاپ اور آگ سے جلا ہوا، سیاہ پُل ہے —— اَب ہماری جیپ اُس پر سے گذرے گی —— پھر فیری میڈو بہت قریب آ جائے گا۔ جب جیپ نے اپنا اگلا ٹائر، اُس بوسیدہ اور گندھک کی بھاپ سے اُبلے ہوئے پُل پر رکھا تو میں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ مجھے لگا کہ اُبلے ہوئے پانی کی بھاپ نے میرے جسم کو جکڑ لیا ہے، عین اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ بکری نے منمنانا بند کر دیا ہے، اور موٹے آدمی کی کہنی میری پسلی میں گڑنا بند ہو گئی ہے —— جیپ نے تاتو نالے کا پُل عبور کر لیا ہے —— چند گز کے بعد میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ رائے کوٹ کے پُل کے بعد پہلی بار ٹھنڈی ہوا کا ایک نامکمل سا جھونکا، مجھے چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ میرے جسم میں زندگی کی لہر پیدا ہوئی، جیسے گہری نیند میں یکا یک، گئی بجلی آ گئی ہو، اور پنکھا چل پڑا ہو —— خوشگوار احساس کے ساتھ —— !

اَب جگہ جگہ چھوٹے بڑے درخت، اِس پگڈنڈی نما کچی سڑک کے کنارے پر ملنے لگے تھے۔ رائے کوٹ کے پُل سے تاتو نالے کے بوسیدہ پُل تک درخت اور جھاڑی نام کی کوئی شے نہیں ملی تھی۔ سنگلاخ زرد، بنجر پہاڑوں میں ایک ویران راستہ، جس کے آثار دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ جنت کی وادی میں جاتا ہے۔ زندگی کا دستور بھی یہی ہے، ولی صفت لوگ کہتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک وحشی اور سنگلاخ رستہ ہے، جو ریاضت و نیکی کے اجر میں جنت کا راستہ بن جاتا ہے۔ یہی حال مجھے فیری میڈو کے راستے کا لگا ہے، رکاوٹوں سے بھرپور، پیاس اور کانٹوں سے اَٹا، آزمائش بھرا راستہ، جس کے دونوں جانب خون پی جانے والے، وحشی اور درندگی سے بھرپور فلک بوس پہاڑ ہیں، اور نیچے گہرائی اور ترائی میں بھون دینے والا تاتو نالہ، پگڈنڈی کا ہر موڑ، زندگی کی پگڈنڈی کی طرح اُلجھا ہوا اور بے طرح ہے۔ معلوم نہیں کہ کب، کیا ہو جائے، پتہ نہیں، سامنے یا اُوپر سے ملک الموت کب آجائے، پانی ملے نہ ملے، راحت کا کوئی گھنا سایہ دار درخت ناپید، ایسے پہاڑ جیسے زندگی کے نا ختم ہونے والے مسائل کی طرح ہر سمت استادہ ـــ حکمت ہے، تو نکلتے چلو ورنہ تڑپ تڑپ کر یہیں مرجاؤ۔ کوئی لاش بھی نہ لے جائے گا، یہیں کسی آگ اُگلتے، انگارہ بنے پتھروں کے نیچے دفن کر دے گا، جو لباس جسم پر ہے، وہی کفن ہوگا، نہ کوئی پرندہ، نہ کوئی ذی رُوح ـــ رکاوٹیں ہی رکاوٹیں، ہمت کرو، منہ میں کانٹے پڑ گئے ہیں تو بھی ہمت کا دامن نہ چھوڑو، بس من من کا قدم اُٹھاتے، بڑھتے چلو۔ بالکل اُسی طرح جیسے زندگی کے ناہموار اور ناانصاف راستے پر سب چلتے ہیں، اور اُف بھی نہیں کرتے۔

ٹھنڈی ہوائیں آنے لگی ہیں۔ سامنے حدِ نگاہ پھیلا ہوا ایک ہرا بھرا جنگل ہے، جس کو دیکھ کر سابقہ سنگلاخ ویرانہ بھول سا گیا ہے۔ جنگل ہر سمت سے اُوپر آسمان

کی طرف اُٹھتا چلا جا رہا ہے، یہ فیری میڈو کا دروازہ ہے، جس کے پار پریاں بستی ہیں، اور سنا ہے کہ پریاں بہت حسین ہوتی ہیں، اُن کا جمال ناقابلِ بیان ہوتا ہے، پریوں کا انگ انگ دل رُبائی اور حسن کے بیش بہا خزانوں کا مسکن ہوتا ہے۔ پری حسن و جمال کی ناقابلِ بیان تصویر ہوتی ہے، اُن کا چہرہ حسن اور نُور کا سر چشمہ ہوتا ہے۔ پریوں کا بدن اور اُن کا انگ انگ کسی حسین ترین عورت سے بھی زیادہ پُر کشش، جاذب اور لطیف ہوتا ہے، وہ شاید فیری میڈو میں رہتی ہیں؛ وہی اُن کا مسکن ہے، اور میں وہاں جا رہا ہوں — شاید پہنچ ہی جاؤں —

اَب سفر پاؤں پاؤں ہے۔ میرے قدم جنگل کی پگڈنڈی پر اُٹھتے چلے جا رہے ہیں، پگڈنڈی جنگل میں گھوم گھام جاتی ہے، پگڈنڈی سے نیچے جو ترائی ہے، وہ پھولوں کی خودرُو خوشبو سے مہک دار ہے، جو درخت پہاڑ کی سمت ہیں، اُن پر ٹھنڈک اور خوشبو، عام دُنیا کے درختوں سے نرالی اور منفرد ہے، سبزہ ہی سبزہ ہے۔ پگڈنڈی اِس سبزے میں لہراتی، بل کھاتی، مڑتی مڑاتی، کبھی اُوپر، کبھی نیچے، خوشگوار جنگل میں گھستی چلی جا رہی ہے، دھوپ کی کوئی بھولی بھٹکی کرن، کبھی کبھی کسی درخت کے گنجان پتوں سے چھن کر جب مجھ پر پڑتی ہے تو اپنی شگفتگی کا جادو سا جگانے لگتی ہے۔ بڑا خوشگوار احساس رُوح اور جسم میں، کسی نرم ہاتھ کی تھپکی کی طرح اُتارتی ہے۔

اَب ہم جنگل کے اِس ناقابلِ بیان گلستان میں کافی اُوپر کی طرف آ گئے ہیں، جو پیر اُس ناتو نالے والی سڑک پر مَن مَن کے بھاری لگ رہے تھے، اَب پھول کی طرح ہلکے اور ترو تازہ ہیں، شاید پریوں نے کوئی منتر پڑھ دیا ہے یا یخ بستہ ہوا نے تازگی عطا کر دی ہے۔ بوجھل شدہ نظریں، اَب ہوا میں کسی طائر کی طرح اُڑتی پھر رہی ہیں — یہ جنت ہے — میں اس جنت کی تلاش میں کب سے مارا مارا پھر رہا تھا،

آج اِس جنت کا مکین ہوں۔ طائرہائے لاہوتی کبھی کبھی دائیں یا بائیں، یا اُوپر نیچے کے درختوں پر جب چہچہاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ پریاں گھنگرو بجا رہی ہیں۔ درختوں کے پتے ہوا کے زور سے تالیاں بجاتے ہیں تو بجاتے ہی چلے جاتے ہیں، ٹھنڈک سے گد گدی کرنے لگتے ہیں۔ پگڈنڈی کے فرش پر نوکیلے اور دھاردار پتھر نہیں ہیں، جیسے تا تو تک بکھرے پڑے تھے، بلکہ دیودار، برج اور شیشم کے نرم اور نازک ریشوں سے پگڈنڈی کا فرش، خاص میرے لئے آراستہ ہے، تاکہ کوئی نوکیلا پتھر میرے پاؤں کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ شاید فیری میڈو کی پریوں کو زخمی پاؤں والا عاشق مسافر پسند نہیں ہے ـــــ!

میری آنکھ کھل گئی ہے ـــــ بجلی پھر چلی گئی ہے۔ ہاتھ کے پنکھے کی سخت ڈنڈی میری پسلی میں چبھ رہی ہے، سگریٹ کے پیکٹ کا کونا، میرے گال میں بار بار چبھتا ہے، پیاس سے میرا منہ اور ہونٹ خشک ہیں، پچھلی گلی میں لکڑی کاٹنے کی آرا مشین بند ہوتے ہوئے، آخری گراری کے سانس لے رہی ہے، ہماری گلی کا موٹر مکینک، کسی اِنجن کو بار بار سلف مار کر تھک سا گیا ہے ـــــ اِدھر میرے اندر فیری میڈو کا خواب پھر ادھورا رہ گیا ہے، میں جبکہ بامِ عروج پر پہنچ گیا تھا، بس اُس وادی اور جنگل کی پریاں، غول در غول آنے ہی والی تھیں کہ حسن و رقص کی محفل ادھوری رہ گئی ـــــ فیری میڈو، واپس اپنی جگہ، بہت دُور چلا گیا، مگر یقین رکھیے میں کل پھر اُس کا خواب آج سے زیادہ خوبصورت دیکھوں گا، یہاں تک کہ ایک دن فیری میڈوز کے سبزہ زار میں، چاندنی رات ہوگی اور پریاں پورے حسن و جمال کے ساتھ، پا برہنہ، میرے حضور رقص کر رہی ہوں گی، اور میں عالمِ مدہوشی میں دادِ حُسن دے دے کر تھکتا نہ ہوں گا، اور وہ رقص کر کر کے عالمِ کیف میں مست ہوں گی ـــــ پھر اُن کا سارا حسن فیری میڈو میں، میری تحسین کا محتاج ہوگا ـــــ اور میں اُس کے حُسن کا اسیر ہوں گا ـــــ!

سَر درد

دماغ میں اگر رسولی یا حسد کا کینسر نہ ہو تو سر درد قطعی طور پر کوئی بیماری نہیں ہوتا، لیکن یہ بیمار بننے کا زبردست آرٹ اور ہتھیار ضرور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سر درد ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ٹھوس اور کامل ثبوت کسی لیبارٹری ٹیسٹ میں دستیاب نہیں ہوا ہے۔ ہاں بس اتنا ثبوت ملتا ہے کہ معمول بر اسامنہ بنا کر بر سرِ عام کہتا ہے کہ میرے سر میں درد ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ سننے والے فوراً مان جاتے ہیں کہ بیچارے یا بیچاری کے سر میں درد ہے، اس مظلوم کو کچھ نہ کہا جائے۔ مگر ایک اور ثبوت بھی ہماری عورتوں میں دیگر یہ پایا جاتا ہے کہ دوپٹہ کس کے، سر ماتھے پر باندھ کر

خاص رونے والی شکل بنالی جائے۔ بس یہ بھی قابلِ قبول ثبوت تصور کیا جاتا ہے۔ مردوں میں ایسے خوفناک سر درد کے لئے، سر باندھنے کی بجائے بار بار سر پیٹنے کا واحد عملی ثبوت ملتا ہے، مگر عورتوں کے ثبوت کے مقابل اِس کو درخورِ اعتناء کامل تصور نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اِس کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ یا تو گھر والی سے پٹ کر آیا ہے، یا پیٹنے میں ناکام ہو کر آیا ہے — واللہ علم بالصواب — !

معاشرے کی سطح پر سر درد ایک قابلِ بھروسہ اور محفوظ ترین بیماری کے طور پر تسلیم کیا جانے والا مرض ہے۔ حالانکہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ یہ بیماری ہرگز نہیں ہے، مگر کوئی میری بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ ایک حکیم صاحب کہنے لگے، جو ہاپڑ کے قدیم حاذق تھے کہ یہ اصل میں بہت سی بیماریوں کا ردِعمل میں مجموعۂ مرض ہے، تو میں گہری سوچ میں غرق ہو گیا، جس کی پہلی وجہ اُن کی حکیمی ڈگری کا علاقائی حصّہ تھا۔ کیونکہ ہماری زوجہ ہاپڑ کی ہیں؛ وہ کہا کرتی ہیں کہ ہاپڑ میں حاذق حکیم ہونے کا کوئی مدرسہ نہیں تھا، اَب بن گیا ہو تو مجھے پتہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ ہاپڑ کے پاپڑ بہت مشہور ہیں۔ یاد رہے کہ حکیم صاحب کی عمر اور ہماری زوجہ کی عمر تقریباً ایک سی ہے۔ بہر حال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سر درد ایک رکھ رکھاؤ والی عالمی بیماری ہے، اور دُنیا کا ہر فرد، اس کے پُر سرور ذائقے سے آشنا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی کو کوئے فرار میسر نہ ہو تو سر درد ایک بہترین بہانہ ہے۔ چونکہ سر درد کا مریض چڑچڑا اور بدمزاج ہوتا ہے تو اُس سے لوگ خواہ مخواہ دُور بلکہ بہت دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہ چھوت کی بیماری بالکل نہیں ہے — جیسے ہی سر درد کا متاثرہ شخص سر درد کا اعلان کرتا ہے اُسے راہِ فرار مل جاتی ہے، اور راہِ نجات کا راستہ کھل جاتا ہے۔ سمجھو کہ سارے دُلدر دُور ہو گئے، نہ ہلدی لگی

نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آیا ___ جس سے جان چھڑانا مقصود ہو، اُسے اپنے سر درد کی مار، مار دو، ہر دو کامیابی ہوگی، یعنی اپنی جان کی بھی متعلقہ شخص سے خلاصی ہو جائے گی اور آپ کو مزید تیاری کا وقت بھی مل جائے گا۔ کسی مہمان سے نجات حاصل کرنا ہو تو کہلوا دیں کہ ابا جی کے سر میں دو پہر سے، بہت درد ہے، گولی کھا کر سوئے ہیں۔ کسی ناپسندیدہ سسرالی عزیز سے ملاقات ناگوار ہو تو باآواز بلند کہلوا دیا جاتا ہے کہ آج صبح سے سر درد ہے، کسی کروٹ چین نہیں آ رہا، بس کمرے کی بتی بند کر کے لیٹے ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں سکون ملتا ہے، اِس لئے روشنی میں آنے سے اجتناب کئے ہوئے ہیں۔ آپ پوچھیں، کیا ڈاکٹر صاحب نے ایسے تاریک ماحول میں رہنا تجویز بہ حصّہ دوائی کیا ہے تو جھٹ سے کہہ دیں گے، جی ہاں، جی ہاں ___ اور اگر دل کرے اور مزید بات کا کوئی موضوع نہ ہو تو اِسی مسئلہ کو چغلے ہوئے نوالے کی طرح بار بار، طرح طرح سے بیان کریں، یہاں تک کہ سامنے والا یا تو فوراً روانہ ہو کر جان بچائے گا، یا پھر مزید نئے سے نئے عزیز و اقارب اور دوستوں کے سر درد اور اُس سے نجات کے قصے، ڈاکٹروں کے نسخوں کے ساتھ بیان کرتا نہ تھکے گا، یہاں تک کہ آپ کے اپنے سر میں شدید قسم کا حقیقی سر درد وقوع پذیر ہو جائے گا۔

ہم نے دیکھا کہ بہت سے ذہین فطین، زمانہ ساز لوگ سر درد سے، بہت سے ایسے انوکھے کام لیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چونکہ اِس کا ثبوتِ مرض کوئی نہیں ہوتا، اِس لئے کامیابی کے امکانات روشن بلکہ سو فیصد تابناک ہوتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہم نے ایک ایسی دُلہن کو دیکھا کہ جس نے شبِ زفاف اپنے دُولہا کو حُجلۂ عروسی میں آتے ہی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی اذیت ناک، بے اعتنائی سے بتایا کہ اِن بھاری کپڑوں یعنی جوڑائے عروسی کے وزنِ کثیر سے، جو دُولہا

کی طرف سے دُلہن کے لئے آیا تھا؛ اُس کے پہننے کے بعد سے شدید سر درد ہے۔ دوپٹہ وزنی کامدار، جو دُلہن کی والدہ کی فرمائش پر بنوایا گیا تھا، اُس کا قصور بسلسلہ سر درد، دلہن نے زیادہ بیان کیا ـــــ دُلہن نے دُولہا کو اپنے ہونٹ اتنے بیہودہ طریقے سے سُکیڑ کر یہ بات کہی کہ دُولہا فوراً دُلہن کا یہ پہلا نخرہ اُٹھانے کو بہ سَر و چشم تیار ہو گیا۔ عیار دُلہن نے دُولہا کی بد حواسی کا فوراً فائدہ اُٹھایا اور کہا ذرا میرا اسلیپنگ سُوٹ تو اٹیچی سے نکال کر دینا؛ میں اِس دُودھ سے، جو دُولہا کے لئے سرہانے تپائی پر رکھا گیا تھا؛ سر درد کی گولی کھا کر سو جاتی ہوں؛ تب ہی سکون ملے گا، ورنہ میرا سر تو درد سے پھٹ ہی جائے گا۔ وہ حُجلہ ٔ عروسی سے اُٹھی، دُولہا کا ہاتھ پکڑا اور کمرے کے دروازے سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ میں ذرا کپڑے بدل لوں؛ تم چاہو تو سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی ہی دیکھ لو ـــــ پھر جو دروازہ بند ہوا تو صبح کی خبر لایا۔ ہاں چند دن بعد جب دُولہا کے حواس ذرا بحال ہوئے اور یادداشت میں ٹھہراؤ آیا تو دُولہا نے بتایا کہ میں تھک ہار کر کمرے کے باہر ہی سو گیا تھا ـــــ رات کے پچھلے پہر ایک پہلو پر لیٹنے سے جو درد ہوا؛ اُس کی کسمساہٹ سے آنکھ کھلی تو میں نے غسل خانے کے حُجلہ ٔ عروسی کی طرف والے بند دروازے سے کان لگا کر سنا کہ دُلہن کسی سے ہنس ہنس کر موبائل فون پر کہہ رہی تھی ـــــ اُس کی فکر نہ کرو، اُس کو تو میں نے پہلے منٹ ہی اپنے سر درد سے فارغ کرا دیا تھا، گھامڑ کہیں کا ـــــ چھوڑو یہ باتیں، یہ وعدہ کرو کہ ہنی موون پر تم ساتھ والا کمرہ ہی لو گے نا ـــــ اَب میرے جانو ـــــ ناں نہ کرنا، ایسا کرنے سے میرے سر میں درد ہو جاتا ہے، تمہیں تو معلوم ہی ہے نا ـــــ !

تجربے میں آیا ہے کہ اگر کسی کے دماغ میں حسد کا کیڑا ہو، تب بڑا شدید سر درد ہوتا ہے، جس پر کوئی گولی اور ٹیکہ اثر نہیں کرتا۔ فقط وہ بات اثر کرتی ہے کہ جس

سے حامل سر درد، برتر و اعلیٰ ثابت ہوتا ہو، اور مخالف نیچ، کمینہ، گھٹیا، بلکہ کم ترین ثابت ہوتا ہو ـــــ یقین مانیں یہ والی ڈوز بڑی نشہ آور، سکون بخش اور دافع سر درد ہوتی ہے۔ گویا آپ کو حاسدانہ سر درد کے مریض یا مریضہ کو یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ تمام دُنیا اور اُس کے لوگ، اُس کے سامنے حقیر ترین ہیں، اور تم ایسے اعلیٰ اور عظیم ہو کہ باقی دُنیا تمہارے سامنے کم ترین سے بھی بدتر ہے۔ تمہارے اعلیٰ ہونے کی مثال روئے زمین پر نہیں ملتی، جس طرح اِن کے ادنیٰ ہونے کی مثال دُنیا میں نہیں ملتی، اِس لئے میں مثال دینے سے قاصر ہوں ـــــ اگر حاسد مرد ہو تو یہ لفظی خوراک بہ شکلِ دوا، اُس کے لئے کامل آبِ حیات ثابت ہوتی ہے اور وہ شخص چین کی گہری نیند، چند منٹ میں سو جاتا ہے، اور جب اُٹھتا ہے تو ہر قسم کے درد سے پاک و پاکیزہ اور تر و تازہ، ہشاش بشاش ہوتا ہے ـــــ اور اگر خدانخواستہ حاسدانہ سر درد، صنفِ نازک کے سر میں ہو رہا ہو تو مذکورہ بالا بات سے فقط نصف افاقہ ہوتا دیکھا گیا ہے۔ باقی مزید افاقے کے لئے باتوں کی قدیمی ٹیپ چلانا، اُسے بار بار ریوائنڈ، فارورڈ کرنا، اُس کی سچائی کا یقین دلانا بہت ضروری ہوتا ہے، حالانکہ یہ ٹیپ چل چل کر بالکل ہی گھس چکی ہوتی ہے، مگر مزا خوب دیتی ہے۔ اِس ٹیپ کا حاصل مصرع یہ ہوتا ہے کہ تم نے تو سب کے لئے سب کچھ کیا مگر ظالموں نے تمہارے لئے کچھ نہ کیا ـــــ یاد رکھیئے یہ آخری جملہ مریضہ کو بہت احتیاط، رکھ رکھاؤ اور محتاط طریقے سے کہیں، ورنہ قوی ترین امکان ہے کہ وہ اِس سے بھی بھڑک جائے گی اور کہے گی ـــــ تم نے اُن کو فقط ظالم کہا، یہ تم نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ اِن لوگوں کی وجہ سے میں آج اِس حال کو پہنچی ہوں کہ کوئی دوا مجھ پر اثر نہیں کرتی؛ کسی نیند کی گولی سے نیند نہیں آتی ـــــ تم آخر اُن مظالم کا ذکر کیوں نہیں کرتے جو مجھ پر ڈھائے گئے کہ جن کی وجہ سے میں دائم المرض ہوتی جا رہی ہوں۔

اِس موقع پر عقل مند نزدیکی انسان جس کو شوہر کہتے ہیں؛ پر لازم ہے کہ وہ فوراً فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر مبنی بیانات کا تانتا باندھ دے۔ اِس حد تک ہونے والے معلوم اور نامعلوم، مظالم اور ناانصافیوں کا ذکر کرے کہ مجلس شبِ عاشور کی طرح مریضہ کی آنکھوں سے دھار کی صورت میں آنسو بہنے لگیں، اور کسی طرح رُکنے کا نام نہ لیں — عاقل شوہر پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی سب سے چھوٹی اُنگلی سے مریضہ کے آنسو، نازک انداز سے احتیاط کے ساتھ اُٹھائے اور کیرم کی گیٹی کی طرح دُور جھٹک دے۔ اِس حساسِ عمل کو بس اتنا ہی انجام دے — اِس سے زیادہ کرے گا تو بات بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، اور سر درد ختم ہونے کا امکان مفقود یا منجمد ہو جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے — جن جن کو وہ بُرا بھلا کہہ سکتا ہے، کھُل ڈُل کر کہے؛ آنسو قطرہ قطرہ اُٹھائے جائے، یہاں تک کہ مریضہ کے پاس آنسوؤں کا اسٹاک ختم ہونے لگے۔ بس یہی نشانی ہوگی کہ لوجی سر درد ختم ہو رہا ہے، اَب مریضہ گہری نیند سونے جا رہی ہے، اُس کے دل کو تسلی، رُوح کو قرار اور حسد کی آگ کو شبنم راحت مل گئی ہے اور وہ سو جاتی ہے۔ حسد کا سر درد اپنی موت آپ مر جاتا ہے — !یاد رکھیے: اَب کوئی آہٹ نہیں ہونی چاہیے، کھٹکا تو بم بلاسٹ کے مترادف شمار ہوگا، کال بیل آف کر دیں، گھر میں سب کے جُوتے اُتروا دیں، برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دے دیں کیونکہ اُس سے دھماکے کا امکان ہے۔ خود سونا منع ہے، سامنے کُرسی پر بیٹھ جائیں اور سر درد کو دُور بھگانے کا منتر متواتر پڑھتے رہیں، اگر منتر جاپ کسی بھی آواز سے ٹوٹ گیا تو آپ کی خیر نہیں — !

یہ تو تھے "سر درد" کے اسباب واثرات وواقعات — مگر ایک چیز جو اِسی قبیل کی دُوسری بھی ہوتی ہے، اُس کو "دردِ سر" کہتے ہیں۔ یوں تو دردِ سر کا لغوی مطلب مصیبت، آفت، پریشانی اور ناگہانی بلا ہوتا ہے، مگر یہ سر درد بھی اپنی نوعیت کا

مزے دار اور پُر لطف سر درد ہوتا ہے۔

ہم نے حکماء سے درد سر کی تعریف پوچھی تو بغلیں جھانکنے لگے۔ ڈاکٹر کو پوچھا تو وہ دیر تک خلاء میں گھورتے رہے اور پھر ایک عام سا اوٹاسن اپنے قیمتی پیڈ پر لکھ دیا ۔۔۔ اپنی پڑوسن جو باجی ٹوٹکا کے نام سے محلّے میں مشہور ہیں، اُن سے پوچھا تو اُنہوں نے پتلے پانی دستوں کا مشہور زمانہ جامن کی گٹھلی والا ٹوٹکا بتانا شروع کر دیا۔ محلّے کی مسجد کے مولوی صاحب سے درد سر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہی تو اُنہوں نے بتایا کہ یہ کثیر گناہوں کا جسمانی ردِ عمل ہے ۔۔۔ یہ بات ہمارے دل کو لگی، ہم نے پوچھا اس سر درد سے نجات کی راہ کیا ہے؟ تو اُنہوں نے فرمایا کہ استغفار کریں: افاقہ یقینی ہے۔

جب درد سر پر ہم نے غور و فکر کے گھوڑے دوڑائے تو بہت سی عقل کی باتیں افشا ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ درد سر کا عملی معیار، ہر کسی کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ وہی بات میرے لئے باعث راحت ہے اور کسی کے لئے درد سر ہے۔ یہ کہ سر درد کسی کے لئے نشہ ہے، سر درد نہ ہو تو طبیعت کو سکون نہیں ملتا، راحت کو بیدار کرنے کے لئے سر درد کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اپنے کام نکلوانے کے لئے سر درد کریں۔ دُوسرے کا سکون برباد کرنے کے لئے درد سر کا نسخہ اپنائیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعض مرتبہ بیوی کا سر درد شوہر کے لئے اور کبھی شوہر کا درد سر بیوی کے لئے، راحت بیکراں لئے ہوتا ہے۔ حسین پڑوسن کا درد سر، دل آئے پڑوسی کے لئے خدمت کے دروازے کھول دیتا ہے، جس سے زمین اور آسمان کے درمیان کا حُسن آشکارا ہو جاتا ہے ۔۔۔ درد سر اگر جوان لڑکی کو رہنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ عفیفہ کو مرضِ عشق نے آ گھیرا ہے ۔۔۔ اگر کو ایجوکیشن اسکول کی اُستانی کے درد سر ہو جائے تو شاگرد لڑکوں کی پریشانی قابلِ دید اور لڑکیوں کا سکونِ شکر، قابلِ رشک ہوتا ہے ۔۔۔ مہترانی کو اگر

درد سر کی شکایت آ گھیرے تو جواباً گھر کی بیگم صاحبہ بھی اِس وبائی مرض میں مبتلا ہو سکتی ہیں۔ سُنا ہے کہ جس کا ازالہ فقط تابعدار شوہر ہی کر سکتا ہے؛ بھائی مجبوری ہے ورنہ ساری رات بھگتنا جو پڑتا ہے ___ افسر کا درد سر پورے دفتر کے عملے کو بید مجنوں بنا دیتا ہے ___ بجلی کے بل میں آج کل یہ خوبی پیدا ہوئی ہے کہ جس اِس ورقِ تازہ کا دخول کسی شریف آدمی کے گھر میں ہوتا ہے تو پورے گھر کے سر میں درد پیدا ہو جاتا ہے؛ خوبی اِس کی یہ ہے کہ یہ اجتماعی درد سر باقی کسی چیز کے ہونے یا آنے سے نہیں وقوع پذیر ہوتا، اور جیسے ہی اِس کو ادا کیا جائے، درد بلا کسی دوا دارُو کے اختتام پذیر ہو جاتا ہے، مگر فقط اِس عمل کا دورانیہ ایک ماہ بیان کیا گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ درد سر بعض مہمان بھی ہوتے ہیں۔ اِس قسم کا درد سر عارضی اور غیر حقیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ سو اِس کا تذکرہ بند کر کے ہم واپس سر درد اور درد سر کے بعض مشترکہ مضرات کی طرف پلٹتے ہیں کہ وہی ہمارا دل پسند موضوع ہے۔

ایک حسین وجمیل، ادا خیز نوجوان ترکی شاعرہ کو سر درد نے آ گھیرا۔ پتہ چلا کہ یہ عارضہ تب سے لاحق ہوا ہے کہ جب سے اُنہوں نے شاعری کا آغاز کیا ہے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ویسے سر درد بالکل نہیں ہوتا مگر فقط اُس وقت ہوتا ہے کہ جب مصرع پھنس جاتا ہے۔ پھر مزید کچھ دنوں میں پتہ چلتا ہے کہ اُن کا تو ہر مصرع خود بخود پھنس جاتا ہے، جیسے حلق میں کانٹا اور نالی میں چوہا پھنس جاتا ہے۔ حل اِس کا اُس ترکی شاعرہ نے یہ نکالا کہ فاضل شاعر سے اصلاح لیتے لیتے اِتنے مصرع پھنسائے کہ وہ خود پھنس گئے اور یہ اُن کی دُلہن بن گئیں ___ مگر اِس کے بعد اُنہوں نے شاعری سے توبہ کر لی۔ میری اطلاع کے مطابق وہ اِنقرہ میں فاضل شاعر کے کئی بچوں کا درد سر پال رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ اَب سر درد کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے۔

غربت بہت ہے!

کون کہتا ہے کہ غربت صرف غریبوں کا مسئلہ ہے — جناب میں ہوں جو کہتا ہوں کہ غربت غریبوں کا مسئلہ نہیں ہے؛ اس لئے کہ وہ بیچارے ازل سے اپنی کم تعلیم، کم دولت، کم وسائل، کم میسر مواقع، کم واقفیت اور کم اقدار کے سبب غریب ہیں۔ مگر اُن کا کیا کیجئے جن کی تعلیم فی زمانہ اعلیٰ، دولت خوب، وسائل بے پناہ، مواقع زیادہ سے زیادہ، واقفیت وہ پاتال سے بھی نکال لاتے ہیں اور پھر بھی غریب ہیں۔ بڑی معصومیت اور مسکینی سے کہتے ہیں — غربت بہت ہے — بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ ہر کسی کے سامنے پیٹ ننگا نہیں کیا جا سکتا، بس زبان پہ

اعتبار کر لیں کہ غربت بہت ہے، کسی درویش نے حیرت سے پوچھا کہ آپ ملک میں غربت کی بات کر رہے ہیں ناں — ناراض ہو کر مست ملنگ لہجے میں فرمانے لگے، نہیں میں اپنی غربت کی بات کر رہا ہوں — ہمیں ملک سے کیا لینا دینا، ہماری غربت کو قدرے افاقہ ہو تو ملک کے بارے میں سوچ پیدا ہو جناب — ! — اُن کے منہ کی مسکینی کو غور سے دیکھا اور اُن کی بات کی گہرائی میں وہ درویش ایسے کھو گیا، جیسے اُسے بیچ بازار کسی نے ننگا کر دیا ہے۔

کئی گھنٹے تو اِس بات پر غور و فکر کرتے گزر گئے کہ غریب لوگ کون ہوتے ہیں۔ بڑا فکر کیا، دماغ کو حاضر بلکہ ناظر کیا، زندگی کے پچاس سال کا غربت کے بارے میں تجربات، مشاہدات اور المیات کا عمیق نظر اور بچی کھچی ایمانداری سے جائزہ لیا، تب جا کر فقط اتنا سمجھ میں آیا کہ غریب وہ ہے کہ جس کی ہوس پوری نہیں ہوتی۔ غریب وہ ہے کہ جس کا پیٹ دولتِ قارون سے بھی نہیں بھرتا، غریب وہ نہیں ہے کہ جس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے بلکہ غریب وہ ہے کہ جس کی نظر میں کھانے پینے کی ہزار نعمتیں جچتی نہیں ہیں۔ کیونکہ اُس کا دل کسی ایسی چیز کے کھانے کو چاہ رہا ہوتا ہے کہ جس میں ہوس کی نشاط کار ہو — !

غریب بیچارے کا کیا ہے، رُوکھی سُوکھی جو بھی سامنے آئی، اللہ کا شکر کر کے کھا لی، ٹھنڈے پانی کا گلاس ملا تو ٹھیک، ورنہ بس پانی ہو، جو پیا جا سکے، اُس پر بھی اُس کا شکرانہ ختم نہیں ہوتا۔ دُوسری قسم کے اعلیٰ غریب بھی قابلِ رحم ہوتے ہیں اور اُن کی بھوکی اولادیں، اُن سے زیادہ قابلِ رحم حالت میں زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ اُن کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی شکر ادا نہیں کرتے، دولت کی غلاظت سے لدے پھندے ہوتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کمپنی کی کار میں بیٹھ کر اُن کو سکون نہیں ملتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ

ہوٹل میں نعمت ہائے جنت کھا کر پیٹ نہیں بھرتا، اُس میں ہزار ہزار کیڑے نکالتے، تھکتے نہیں۔ ذائقہ ہر چیز کا ناقص محسوس ہوتا ہے، عمدہ سے عمدہ کپڑا دل کو نہیں بھاتا، کم قیمت اور اچھے اوصاف کے مالک لباس پر تھوکتے نہیں تھکتے، بڑی سے بڑی کوٹھی، روز پہلے سے زیادہ چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ اصل میں غربت جو بہت ہوتی ہے کہ کچھ دل کو بھلا لگے۔ دل کی غربت اور طلب کی حسرت ناک غربت جو کسی کل چین نہیں لینے دیتی۔

ہوسکتا ہے کہ میری طرح آپ بھی ایسے شاہی غریبوں کو کثرت سے جانتے ہوں کہ جن کی غربت ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ـــــ ہم علاج کیسے کرائیں، غربت ہی بہت ہے، علاج معالجہ بہت مہنگا ہے، ہم جیسے سفید پوش غریبوں کا کیا بنے گا ـــــ؟ وغیرہ وغیرہ۔ درویش نے یہ سنا تو بہت گھبرا گیا، اس نے سمجھا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ غریب لوگ ہوں، مگر جب بہ نظر عمیق جائزہ لیا تو کچھ ایسی صورتِ حال سامنے آئی ـــــ!

محترم غریب صاحب کی کوٹھی پورے ایک کنال کی دومنزلہ، بہ مثلِ دُلہن سجی دھجی تھی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے، پانچ مرلے پر بنے ڈرائنگ رُوم میں کوئی تین سے چار لاکھ کے کرسٹل ڈیکوریشن دھرے تھے، لاکھ روپے کا تو گھٹیا سا کارپٹ بچھا تھا، جس پر وہ ازحد شرمندہ تھے۔ چنگڑی نما بیگم صاحبہ بار بار شرمندگی سے مری جاتی تھی کہ اس ناقص کارپٹ سے تو ناک کٹ جاتی ہے، بہت گھٹیا مال ہے یہ ـــــ شرم آتی ہے، جب کوئی مہمان اس پر اپنے پیر رکھتا ہے تو ـــــ!

کئی سو مربع فٹ کے احاطے پر مشتمل باورچی خانہ چنگڑی بیگم کے لئے انتہائی باعث توہین تھا۔ وجہ اس کی اُنہوں نے یہ بیان فرمائی کہ اس باورچی خانے میں "لبریری" تو ہے ہی نہیں، جس کا اُن کو شدید صدمہ تھا۔ درویش نے پوچھا کہ آپ کی تعلیم شریف کیا ہے، تو عزیزہ محترمہ شرما کے صاف گوئی سے بتانے لگیں کہ چوتھی

سے ''نس'' گئی تھی۔ درویش یہ سُن کر گھبرا گیا اور مزید بات بڑھانا مناسب خیال نہ کیا کہ کہیں راز درونِ خانہ مزید افشانہ ہو جائیں۔ پوچھا کہ آپ کو پھر بھی ''لبریری'' کا شوق ہے۔ مسکرا کر، دایاں ناک بائیں طرف ایک نادر ادا سے سُکیڑ، اور مار کر بولیں کہ بچے جو پڑھا رہی ہوں۔ درویش نے وہاں ایک اخبار دیکھا، جو تصویر اور خبر سے آج کا لگتا تھا۔ پوچھا آپ کو اخبار پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ نخرے کے خاص انداز سے ناک مار کر فرمانے لگیں۔ لکھ لعنت بھیجو جی اخبار پر ــــ اخبار تو سٹیٹس کی نشانی ہوتا ہے، آپ کو نہیں پتہ ــــ اگر کسی گھر میں روز اخبار نہ آئے تو بڑی بدنامی ہوتی ہے۔ درویش نے کہا، وہ کیسے ــــ کہنے لگیں، اکثر محلّے والے منگوا لیتے ہیں، نہ دو تو بہت ذلیل کرتے ہیں ــــ ویسے ہمارے گھر میں یہ اخبار بہت کام آتا ہے، جو کھانا روز شام کو بچ جاتا ہے، وہ ڈرائیور اور ''نک رانی'' اس میں لپیٹ کر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ میرے صاحب اور میں بڑے دیالو ہیں، کسی نوکر کا حق نہیں مارتے، اُن کو خوش رکھتے ہیں، اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے جی کہ اکثر وہ میرا کوئی ٹیلی فون سُن لیں تو صاحب کو نہیں بتاتے، اور صاحب کا سُن لیں تو مجھے نہیں بتاتے، بہت نیک نوکر ہیں، آج کل ایسے نوکر کہاں ملتے ہیں۔ ہم ناں اُن کو پورا پورا راضی بھی تو رکھتے ہیں ــــ !

ارے ــــ آپ کے یہاں تو کُک بھی ہے؛ درویش نے کُک کو صاف سُتھری وردی میں دیکھ کر اظہارِ حیرت کیا ــــ اس پر وہ ایسے شرما گئیں، اور لال ہو گئیں جیسے وہ غسل فرما رہی ہوں، اور درویش بلا اجازت، بھولے سے اچانک وہاں داخل ہو گیا ہو ــــ جی یہ صفائی پسند بہت ہے، اور کھانا بھی مزے کا بناتا ہے، میں تو پانی بھی پیتی ہوں تو اس ہی کے ہاتھ سے پیتی ہوں، اُس کا ذائقہ ہی اور ہوتا ہے ــــ آپ کو پتہ نہیں جناب کہ اِس کُک صاحب کا نخرہ بھی بہت ہے ــــ آپ

اِس کے نخرے سے تنگ نہیں ہوتیں ـــ نہیں نہیں جی ـــ اَب تو مجھے اِس کا نخرہ پسند آ گیا ہے یہ کہہ کر چنگڑی بیگم نے دوپٹہ کے پلّو سے ایسے اپنا آدھا منہ چھپا لیا، جیسے چوتھی کی دُلہن چھپاتی ہے، مگر اُس کی آنکھیں میوزک کی طرح بول رہی تھیں ـــ کیا نخرہ ہے جی اِس کا ـــ اُووف، نہ پوچھیں، میں تو اِس کے نخرے کے ناز اُٹھاتی ہوں، اِس لئے کہ اِس کے ہاتھوں میں جادُو بھرا ذائقہ ہے، جس چیز کو چھو لے، اُسی میں نشہ بھر جاتا ہے۔ جس دن نوکری پر رکھا تو اُس نے آتے ہی شرطیں رکھ دیں، شرطیں تو کئی تھیں، مگر ایک شرط نے تو میرا دل جیت لیا؛ کہنے لگا کہ جب میں صبح کچن میں آؤں اور آپ کا وہاں آنے کا ارادہ ہو تو آپ نہا دھو کر، نیا لباس پہن کر، جس میں کوئی شکن نہ ہو، اور اعلیٰ قسم کا خوشبو والا سپرے لگا کر کچن میں دروازہ ''ناک'' کر کے آسکتی ہیں۔ وجہ اُس کی اُس نے یہ بیان کی کہ اِس سے کھانے میں برکت ہوتی ہے ـــ درویش نے گھبرا کر پوچھا، کیسی برکت؟ تو وہ پھر سے شرمانے لگیں ـــ سنیں جی وہ کہنے لگا کہ آپ کچن میں آجائیں گی تو اپنی مرضی سے واپس نہیں جا سکتیں؛ پھر جانا میری مرضی سے ہوگا، اور یہ بھی کہ جب آپ اور میں کچن میں ہوں تو کوئی دُوسری گھر کی ''نوکرانی'' تک کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوگی، اِس سے بے برکتی ہو جاتی ہے۔ مجھے پسند نہیں کہ میرے پکتے کھانے کو کسی ایرے غیرے کی نظر لگے ـــ جتنا خوبصورت ڈریس آپ پہنو گی، اور خوشبو لگاؤ گی، اُس دن کا کھانا، اتنا ہی مزے دار بنے گا۔ سجاوٹ اُسے بہت پسند ہے ـــ درویش نے جھٹ پُوچھا، کس کی سجاوٹ ـــ ہر چیز کی سجاوٹ؛ دیکھیں نا جی، جس دن میں اُس کی پسند کی لپ اسٹک نہیں لگاتی، وہ کہتا ہے کہ آج سالن میں رنگ رُوپ ہی نہیں آ رہا۔ سارا دن اُس کا مُوڈ خراب رہتا ہے ـــ

مہینے کے سات دن تو اُس کا مُوڈ لازمی خراب رہتا ہے — وہ کیوں —؟ صرف سات دن کیوں —؟ وہ اِس لئے ناجی کے میں نہا نہیں سکتی نا — آپ اچھے پڑھے لکھے ہیں کہ آپ کو سمجھ ہی نہیں آ رہا — عورت کی مجبوریاں ہوتی ہیں ناجی — درویش گھبرا گیا اور مزید سوال کیا تا کہ بات بدلے — آپ کو یہ ملا کہاں سے — ہائے یہ نہ پوچھیں؛ بڑے پاپڑ تلے، پھر ملا — کیسے پاپڑ — ؟ — یہ میاں صاحب کے گھر کُک تھا، میری نظر اِس پر پڑی، اور میں نے اِس کا کھانا کھایا تو دِل خوشی سے پاگل ہو گیا — ہوا یہ کہ ایک دِن میاں صاحب کی بیگم گھر پر نہیں تھیں تو اُس نے مجھے باورچی خانے میں بلا کر چپکے سے کھانا کھلا دیا۔ بس اُس کھانے کا میرے اندر جانا تھا کہ میں ذائقے اور لذت کی مستی سے دیوانی ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا اور نشہ اُترا تو میں نے اِس کو کہا تُو میرے پاس آ جا — جو کہے گا دُوں گی؛ جو مانگے گا اُس کو انکار نہ کروں گی، جس وقت طلب کرے گا نواز دُوں گی؛ بس تُو اپنی تنخواہ بول۔ بڑے پیسے مانگے اِس کم بخت نے، میں نے کچھ سوچا اور کہہ دیا کہ پانچ ہزار اُوپر دُوں گی، اَب اِنکار نہ کرنا۔ بس اگلے دِن صبح صبح یہ میاں کا کام چھوڑ، میرے گھر آ گیا — کہنے لگا وہ ''کھچڑی'' تم سے دس سال بڑی تھی، اِس لئے کھانا پکانے میں نہ مزا تھا نہ ذائقہ اُترتا تھا — درویش نے حیرت سے پُوچھا، وہ آپ کو ''تم'' کہتا ہے —؟ — ہاں تو، جب کبھی مُوڈ میں ہو اور سیخ کباب کا مصالحہ بنا رہا ہو تو ''تُو'' بھی کہہ دیتا ہے، جس سے پُرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ یہ تم اور تُو والی شرط تو جس دن میاں صاحب کے کچن میں کھانا کھلایا تھا، اُسی وقت طے ہو گئی تھی — درویش نے جب اُس کی تنخواہ سُنی تو محسوس ہوا کہ چنگڑی بیگم ایسے اُداس ہو گئی جیسے کسی نے اُن کے بدن سے لہُو نکال کر زرد پانی بھر دیا ہو۔ تنخواہ کا سُن کر درویش کا منہ

بھی مینڈک کی طرح کھلا کا کھلا رہ گیا ___ تب چنگڑی بیگم بولیں کہ کاش ہم امیر لوگ ہوتے تو میں اِس کو اُس کا حق زیادہ دیتی۔ ہم تو بہت غریب لوگ ہیں، بڑی مشکل سے گزارہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر درویش بے ہوش ہوتے ہوتے بچا ___ دیکھیں نا، بچوں کی فیس اور شام کی فالتو پڑھائی کا خرچ، چار بڑی کاروں کا خرچہ، بجلی، پانی کے بل، اِن دو ''نک رانیوں'' کی تنخواہیں، بیماری شماری کا روز ڈاکٹری خرچہ، کپڑا لتا، لینا دینا، اور مہینے میں دو چار زیور بنوانا، اتنے خرچے ہوں تو بادشاہ بھی غریب ہو جاتا ہے، ہم تو پھر عام سے مسکین لوگ ہیں۔ بس شاہ جی میں تو ماں باپ کے گھر بھی غربت کا رونا روتی تھی، اور آج بھی غربت کا رونا روتی ہوں۔ بس نصیب ہی ایسے ہیں، کیا بدلا ہے میری زندگی میں۔ میں تو میاں سے یہی کہتی ہوں کہ آخر ہماری غربت کب ختم ہوگی ___ آپ کے والدین کیا کام کرتے تھے؟ ___ شرما کر اور کھسیانی سی ہو کر فرمانے لگیں ___ بس چھوٹا سا اپنا کاروبار تھا، اَب بتاتے شرم آتی ہے ___ !

یکایک مجھے احساس ہوا کہ دو وقت کی روٹی کے محتاج خاندان، مزدور کی غربت، چھابڑی فروش، موچی، نالے پر انڈے بیچنے والے کی غربت، سفیدی کرنے والے اور دیہاڑی دار کی غربت تو کوئی غربت ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ چونکہ بات بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے، اور ہر وقت رحمتِ باری تعالیٰ کے پُر اُمید منتظر ہوتے ہیں؛ رُوکھی روٹی اچار یا باسی سالن سے کھا کر، مانگے کے کپڑے پہن کر بھی اللہ کا شکر فراخدلی اور اعتماد سے ادا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ غریب کیسے ہو سکتے ہیں؛ اُن کے شکرانے صاف بتاتے ہیں کہ سفید جھوٹ بولتے ہیں؛ اپنا سب کچھ چھپاتے ہیں، اس لئے کہ یہ شکر گزار ہوتے رہتے ہیں، اور شکر گزار وہی ہوتا ہے جو سب کچھ رکھتا ہو، کسی شے کی اُسے کمی نہ ہو، سب وافر ملتا ہے تو یہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں؛ ورنہ کسی کا دماغ

خراب ہوا ہے کہ دو وقت کی روٹی میسر نہیں، نہ کار، نہ کوٹھی، نہ بنگلہ، بچے ٹاٹ کے اسکول میں پڑھتے ہوں، ماں سارا دن گھر گھر برتن مانجھتی ہو، اور عزت اُس کی محفوظ اور پاک دامن ہو، باپ سارا دن گرمی ہو یا بلا کی سردی، پسینے سے شرابور محنت میں جتا ہو، اور پھر شام کو شکر بجالاتا ہو ـــــ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ کام کرنے والے غربت کا رونا کیوں نہیں روتے، غربت کا رونا تو اِنہی کا حق ہے اور یہ ہیں کہ مسکراتے ہوئے شکر پہ شکر ادا کرتے ہیں، نہ ماتھے پر بل آتا ہے اور نہ چہرے سے مسکراہٹ اور تحمل کم ہوتا ہے، نہ چوری کرتے ہیں، نہ ڈاکہ ڈالتے ہیں، جیب مال سے خالی ہے، عورتوں کے پاس نہ پھوٹی کوڑی ہے، نا کوئی سونا، زیور، نہ کوئی وسیلہ، نہ مال بنانے کا کچا پکا راستہ ـــــ پھر بھی یہ شکر کیے جاتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں ـــــ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ اللہ کے سادے سے بندے ہیں۔

غربت اِن کی محتاج ہے، یہ غربت کے محتاج نہیں ہیں ـــــ اِن کے سُوکھے ہڈیاں نکلے منہ سے کبھی نہیں نکلتا کہ غربت بہت ہے ـــــ !

خباثت

میری ذاتی ڈکشنری میں لفظ مذکورہ خباثت ایک نہایت لطیف لفظ کا درجہ رکھتا ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی لغت میں اس لفظ کو لطافت کا درجہ پچھلے کچھ برس کے سیاسی شعور کی بلند پروازی، قوت بد لحاظی اور بربادیٔ احترام کی عظمت کے سبب عطا کیا ہے! آگے مستقبل میں مزید کیا ترقی و ارتقاء ہوتا ہے، اس کا مجھے قطعی اندازہ نہیں ہے، اور ہو سکتا ہے کہ یہی لفظ آپ کے یہاں انتہائی کثیف اور مردود کہلاتا ہو ـــــ مگر ہاں خباثت کے تانے بانے پوری انسانی تاریخ سے گہرائی کے ساتھ ہمیشہ سے جڑے رہے ہیں۔ بس اتنا کہنا کافی سمجھا جائے کہ خباثت کی

خوبیوں کا تعلق، اِس دُنیا کے عالمِ حیات میں سب سے زیادہ، فقط حضرت انسانی ہی سے جڑا نظر آتا ہے۔ چرندوں، پرندوں کی خباثت کے قصّے اور حوالے اوّل تو ملتے نہیں، اور اگر کسی ریچھ، شیر، بندر، لومڑی، لگڑ بگڑ، ہاتھی یا بچھو وغیرہ کی خباثت کے کچھ واقعات تاریخ میں مندرج ہیں تو اُن کا احاطۂ عمل، افسوس صد افسوس کہ فقط جنگل یا ویرانہ ہے، اور انسان کا بھلا جنگل سے کیا تعلق — دُوسرے یہ کہ اِن پھاڑ کھانے اور کاٹ کھانے والے جانوروں کی خباثت کے قصّہ جات، اُن جانوروں کے کسی مستند یا غیر مستند مورخ یا صحافی جانور نے نہیں بیان کیے بلکہ یہ روایت بیانی کا کارنامہ بھی فقط حضرت انسان کے حصّے میں آیا ہے، اور انسانی راویوں نے اُسے جانوروں کی خباثت سے تعبیر کیا ہے۔ اَب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جانوروں کے قول و فعل کے قصّے کہانیاں، جو مقدار اور تعداد میں بہت کم تاریخ میں دستیاب ہیں؛ اُن کو راوی نے کیسے اور کس طرح عملِ خباثت کے ذیل میں ڈال کر، خود کی جان اِس قضیے سے چھڑائی ہے — ہوسکتا ہے کہ طرف داری یا بدلحاظی کی گئی ہو، یا بندر، ہاتھی، ریچھ، بچھو پاگل ہو گئے ہوں، اور عجیب عجیب بدفطرتی پر مبنی حرکات و سکنات اور عملیات کا مظاہرہ کرتے ہوں — مجھے لگتا ہے کہ یہ کلیہ سب طرح کے چرند پرند پر لاگو نہیں ہوتا۔ یہ بات اِس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں کبھی بھی جنگل میں جانا پڑ سکتا ہے، اور یہ اطلاع ہمارے قول و فعل اور زندگی کے بارے میں خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ اِس لئے اِس خوف کے سبب جانوروں سے خاص الخاص معذرت کے ساتھ، اُنہی کے حق میں عرض کر رہا ہوں کہ چونکہ اُن کی خباثت، اُن کے کسی بھائی بند نے عالمی سطح پر بیان نہیں کی، اِس لئے وہ تو خباثت کے ذیل سے قطعی فارغ مانے گئے ہیں، بلکہ اُن معصوموں کی خباثتوں کا راوی اور بیان کنندہ چونکہ حضرتِ انسان ہے تو کچی بات یہ سمجھ

میں آتی ہے کہ یہ کافی حد تک مصدقہ اور سچ پر مبنی نہیں ہے ___ دروغ بر گردنِ راوی، یہ حضرتِ انسان کی کارروائی لگتی ہے، جس نے اپنی خباثیات کو جانوروں پر فِٹ کر کے اپنے آپ کو معصوم اور بے گناہ ثابت کیا ہے۔

وہ اس طرح کہ اگر کوئی اپنی خباثیات کو کسی دُوسرے کے اعمال میں منطبق کر دے تو خود کو بہت ہلکا پھلکا اور جنتی سا محسوس کرنے لگتا ہے؛ جیسے سارے بوجھ اُتر گئے ہوں، مثال اس کی چھوٹی سی یہ ہو سکتی ہے کہ حضرتِ انسان ایسا کر کے بڑی راحت اور آسودگی محسوس کرتا ہے۔ یاد رہے کہ ہر انسان عملِ خبیث پر قادر نہیں ہوتا، یہ باتیں فقط اُن کی ہیں جو عملِ خباثیات میں سر سے پیر تک شریک بلکہ آلودہ ہیں۔ شریکِ خباثت کا وطیرہ کچھ یوں ہوتا ہے، کہتا ہے کہ ___ پہلے اس کو ٹھیک کرو، پھر مجھ سے اُمید رکھو ___ پہلے اُس کی غلط پارک شدہ کار ٹھیک جگہ لگواؤ، پھر میں لگاؤں گا ___ پہلے اُسے رشوت سے روکو، پھر میں بھی نہیں لُوں گا ___ پہلے اُسے کہو کہ سچ بولے، پھر میں بھی بول لُوں گا ___ پہلے اُس سے کہو کہ اپنے مکان کا نقشہ پاس کرائے، پھر میں بھی پاس کراؤں گا ___ وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے غور فرمایا ہو گا کہ مذکورہ بالا عمل میں حضرتِ انسان اپنی گفتگو اور دلیل میں مستقبل کا صیغہ "گا" کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کام کرنے سے انکار کر رہا ہے؛ وہ راضی ہے مگر رضا کے لئے شرائطِ شیطانی ہمراہ لگا دیتا ہے۔ کیا خوب ذہانتیں اور راہِ فرار ہے کہ ہاں بھی کرتے ہیں مگر نہ ہی نہ کے ساتھ۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ یہ سب لوگ اس بہانے پُورا معاشرہ سُدھارنا چاہتے ہیں۔ نہیں، بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے پُورے معاشرے کو سُدھارو، پھر ہم بھی سُدھر جائیں گے۔ لیکن یہ نہیں کہتے کہ پہلے میں انفرادی طور پر

اپنے آپ کو سُدھارتا ہوں، پھر باقی بھی سُدھرنے لگیں گے ـــــ مگر ہائے کیا کہیے، اگر ثانی الذکر صورتِ حال بن جائے تو کوئی غم نہ رہے؛ مگر اوّل الذکر کا تعلق فطرت ہائے خبیثہ سے ہے؛ اور فطرت خبیثہ کا بُت کانچ سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے، اور اُس کی رُوح خبیث کہلاتی ہے۔ فطرت کو رُوح سے اور رُوح کو فطرت سے الگ کرنا ایک ناقابلِ عمل پروگرام کہلاتا ہے، جس کو دُوسرے لفظوں میں ''خبیث الدھر'' بھی کہتے ہیں، خیر ہمیں خبیث الدھر سے کیا لینا دینا ـــــ !

رائے سب کی اپنی اپنی ہوتی ہے، اور زبان کسی کی پکڑی نہیں جا سکتی۔ ایک مولانا صاحب کہنے لگے کہ خبیث تو فقط جہنم رسید ہوگا؛ اُس کے لئے آخرت میں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ ہم نے کہا کہ حضرت قبلہ ـــــ آخرت میں جو ہوگا، سو ہوگا، فی الحال تُو دُنیا میں فساد برپا کر رہا ہے، یہاں اُس کی اِن خبیثانہ حرکتوں سے جو پبلک پریشان ہے، اُس کا اجر و ثواب کیا ہوگا ـــــ کہنے لگے مَردُود کہلاتا ہے، دُنیا اچھے لفظوں سے اُسے یاد نہیں کرتی، تُھو بھیجتی ہے۔ یہ دُنیاوی اجر ہے کہ معاشرے میں اچھا خاصہ رُسوا ہے۔ ہم نے عرض کیا؛ حضرت قبلہ، اگر اُسے دُنیاوی تُھو کا احساس ہوتا تو سُدھر نہ جاتا؟۔ فرمانے لگے، شیطان پر ساری دُنیا، بلا فرقہ و مذہب لعنت کرتی ہے؛ وہ سُدھرا ـــــ ؟

ایک صاحب نے ہمیں ہمارے لفظ سے پکڑ لیا، جیسے گردن سے پکڑا جاتا ہے، اور سوال اُٹھایا کہ یہ بتائیں کہ آپ کے نزدیک خبیث و خباثت ایک لطیف لفظ کی اہمیت رکھتا ہے، ہم نے تصحیح کی کہ فقط خباثت، حاکمانہ لہجے میں بولے، یہ بتائیں وہ کیسے ـــــ ؟

ہم گہری سوچ میں غرق ہو گئے، اپنی بات کا خاطر خواہ دفاع جو کرنا تھا ـــــ عالمِ استغراق طاری ہوا، آنکھیں نم وا ہوئیں، سوچ و فکر ایک نکتے پر مرکوز ہوئی، دیکھا

کہ ایک بزرگ سفید بُراق داڑھی، لمبی اتنی کے پیٹ تک نہایت ادب و احترام سے آتی تھی، بھنویں سفید ابرک کہ مکھی بیٹھے تو دُور سے نظر آئے، صحت نہایت عمدہ، داڑھی سے مبرا گالوں پر سُرخی ایسی کہ نوجوان کی جوانی کو مات کرے، ماتھے پر نہ بَل، نہ سلوٹ جیسے عمر فقط بیس سال سے زیادہ نہ ہو، دانت موتیوں کی طرح جڑاؤ، ہونٹ تراشیدہ اور گلابی، گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ تر و تازہ، آنکھوں میں چمک جس میں برق لپکتی تھی، اور پلکیں سیاہ جیسے سُرمے سے رنگی ہوں — دل کہتا کہ کمال نُورانی صورت ہے؛ اُن کی آنکھوں کی لپک چمک کہتی کہ دال میں کچھ کالا ہے، غرض کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ یہ بھی نہ یاد پڑتا تھا کہ حضرت کو کہیں دیکھا ہے، مگر پھر خیال آتا کہ بارہا دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے، اِس میں یادداشت قطعی طور پر ٹھیک کام نہ کرتی تھی، بہر حال عالمِ استغراق طاری تھا، اور وہ سامنے جمے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے، میاں کیا سوچتے ہو — ہم نے پریشانی اور شش و پنج کی حالت اور نیم غنودگی کے عالم میں کہا — حضرت ہم غلطی سے کہیں لفظ خباثت کو لطیف کہہ چکے ہیں، اَب دُنیا ہمارے پیچھے ہے کہ ثابت کرو، اور ہم ہیں کہ کسی طرح بھی ثابت نہیں کر پا رہے؛ سو، ایسی اُدھیڑ بُن اور پریشانی میں غلطاں و پیچاں ہیں، کوئی صورت، کوئی راہ نظر نہیں آتی کہ آپ کا دیدار ہوا ہے، آپ ہی کچھ مدد فرمائیں۔ حضرت نے ایک خبیثانہ مسکراہٹ عطا فرمائی اور فرمانے لگے۔

یہ دُنیا خبیثوں کی جنت ہے، اور جنت خود بہت لطیف ہوتی ہے۔ اُس میں خباثت نہیں ہوتی، خبیث ہوتا ہے۔ حکمت اِس متضاد بات میں یہ ہے کہ جو بھی خبیث ہوگا، اپنی جنت خود بنالے گا۔ لوگ اُس کی چالبازیوں کو حکمت، موقع پرستی اور سیاسی تال میل کہہ کر واہ واہ کریں گے۔ یہ گروہ بڑی تیزی سے ترقی کرتا ہے، میں اِن کو خوب اچھی طرح سمجھتا بھی ہوں، اور جانتا بھی ہوں۔ یہ بڑے انمول لوگ ہوتے ہیں، اِن

کی ہر ادا اور ہر بات میں خباثت کے حُسن کا جوہر ہوتا ہے۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ آپ جیسے لوگ اُن کی رمزیں نہیں سمجھتے؛ بس جواباً اتنا کہتے ہیں کہ سالا بہت خبیث ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہوتا، وہ چلتے پانی کے ساتھ چلتے ہیں، جیسا ہوا کا رُخ ہو، ویسا رُخ اپناتے ہیں، جیسا معاشرہ ہو، اُس کی کمزوری سے اپنا کام نکالتے ہیں؛ کسی کو اپنی بات یا کرتُوت سے ڈس لیں تو فوراً معصومیت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں کہ ڈسے جانے والا، اُس کو اپنی غلطی تسلیم کر کے خدا کے سامنے گڑگڑانے لگتا ہے، اور اگر زمانہ اِسی ڈگر پر ہو تو پھر وہ بھی وہی رُوپ اختیار کر لیتا ہے اور وہی کرنے لگتا ہے جو اُس کے ساتھ ہوا تھا۔ یہی تو لطافت کا پہلا مرحلہ ہے، جس نے یہ خیریت سے پار کر لیا، سمجھو ترقی کر جائے گا۔ پُوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں، جب وہ خباثت کی یہ منزل طے کر لیتا ہے تو اُس کا بڑا نام اور مقام بن جاتا ہے، پھر وہ مسلکِ خباثت کی اگلی منزل میں آ جاتا ہے، جس کو ابھی تم نہیں سمجھ سکتے۔

جی حضرت — شاید نہیں سمجھ سکتا، مگر وہ لطافت ....؟ ارے وہ بھی بتاتا ہوں، کیا عرض کروں، اتنی مثالیں خباثیات کی ہیں کہ دفتر کے دفتر، بھر جائیں، پورے پورے کتب خانے لکھے جائیں مگر ختم نہیں ہوتے اِس کے اسباق، اِس لئے میں تم کو فقط فارمولا بتا رہا ہوں، یعنی ہمارے مکتب کے اعلیٰ اسباق، انہی سے تم اندازہ کر لو گے اور تم بھی اِس راہ کے مسافر بن سکتے ہو — نہیں نہیں — میں صرف خباثت کی لطافت کو سمجھنا چاہتا ہوں، اُس میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا، مجھے اُس کا مُحب نہیں چاہئے — تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو، ابھی تم اِس کی دُنیاوی لطافت کو جان ہی نہیں سکے، جب جان جاؤ گے تو مان جاؤ گے، اور جب مان جاؤ گے تو ہماری دُعا سے مہان ہو جاؤ گے — دُنیا قدر کرے گی، اور تم اُس کو اپنے پیروں میں رُولنے لگو گے

ـــ سَر ـــ یہ تو درویشانہ باتیں ہیں ـــ خباثت کا درویشی سے کیا تعلق ہے؟ تعلق ہے ـــ تعلق ہے ـــ لوگ احمق بننا چاہتے ہیں، اُن کو صحیح احمق بنانے والا نہیں ملتا، جو ملتا ہے، اُس کی وہ قدر کرتے ہیں، تم ابھی اِس معاملے میں بچے ہو اور کچے ہو، جب سمجھدار ہو جاؤ گے تو میری باتوں کی سچائی پر دن رات سر دھنو گے ـــ وہ کیسے حضرت ـــ؟

یہ تو تم مانتے ہو نا کہ یہ دُنیا عالمِ سفلی ہے، عالمِ علوی اُوپر، بہت اُوپر ہے۔ انسان کی دسترس سے قطعی باہر ـــ جب ہمیں عالمِ سفلی میں جینا ہے تو عالمِ سفلی کی طرح جیو۔ جو لوگ چاہتے ہیں وہ کرو ـــ لوگوں کو خوش رکھنا بھی عبادت ہے، اپنی غرض کو سب سے اُوپر اور اعلیٰ رکھو۔ یہ زندگی فقط ایک بار ملتی ہے، تو دُکھی ہو کر کیوں گزاری جائے، جو جی چاہے دین مذہب اختیار کرو، اِس سے تم کو کوئی نہیں روکتا، یہ دُنیا میں رہنے کی ضرورت کا درجہ رکھتی ہے ـــ یاد رکھو اپنی غرض کی وجہ سے اپنا آپ قطعی دُکھی نہ کرو ـــ مثلاً یہ کہ اگر منافع کم محسوس ہو تو زبان سے بدل جاو، کوئی تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا، یہاں تک یقین رکھو کہ وہ تمہاری بات مان لے گا ـــ غلطی خود کرو تو کبھی نہ ماننا کہ تم نے غلطی کی ہے، یہاں تک بار بار زور ڈالو، جھوٹی سچی دلیلیں دو؛ خواہ وہ غیر منطقی اور بودی ہوں، پھر ایسا ہوگا کہ وہ تم کو سچا اور اپنے آپ کو غلط مان کر تاوان بھر دے گا ـــ دُوسرے کا نقصان کرو تو گھبرانا نہیں، یہاں تک کہ وہ گھبرا جائے گا ـــ اگر تم کو نفع ملتا ہو تو زبان پر زبان بدلو، فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا ـــ کسی پر الزام لگاؤ تو اُس پر پکے رہنا، خواہ دُوسرا سچا ہو، دیکھنا ایک دن وہ مان جائے گا کہ میں ہی ملزم ہوں ـــ جب قانون کے پھندے میں پھنس جاؤ تو ہر طرح کا حیلہ بہانہ کرو، خواہ وہ کتنا ہی بے وزن کیوں نہ ہو، سوچو اور رستہ نکالو، نکل آئے گا ـــ افکارِ خباثت کہتے ہیں کہ اتنے خود غرض ہو جاؤ کہ کسی رشتے اور کسی تعلق

کو خاطر میں نہ لاؤ، بس اپنا کام نکالو ___ اور بھی بہت سی باتیں اور مثالیں ہیں، مگر میں نے تم کو کل کلیہ سمجھا دیا ہے، اِس کے دائرہ میں رہ کر وہ کر ڈالو، جو ممکن ہو سکے۔

واہ بڑا تجربہ ہے آپ کا ___

حضرت برملا بولے ___ اِس لئے کہ ہم دن رات یہی کارِ خیر کرتے ہیں اور تھکتے نہیں ہیں ___ اَب تم یہ مست اور خوابیدہ آنکھیں کھولو اور لطافتِ خباثت میں جُت جاؤ ___ ہم نے آنکھیں مزید کھولنے سے پہلے بے اختیار یہ سوال کیا کہ یا حضرت آپ کی تعریف شریف ___ فرمانے لگے ___ کمال ہے کہ ابھی تک تم نے اپنے عزیز شیطان کو نہیں پہچانا ___ یہ سُننا تھا اور منہ سے لاحول کہنے کا سوچا ہی تھا کہ وہ حضرت غائب ہو گیا ___ ؟

میں نے اپنی ذات کی لُغت نکالی اور خباثت کے ساتھ لکھے لطافت کے لفظ کو ہمیشہ کے لئے قلم زد کر دیا ___ !

دستُور

دُنیا کے ہر معاشرے میں رشوت ایک مکروہ، گھنونا اور نا قابلِ معافی جرم ہے ـــــ لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تحفہ، نذرانہ، عطاء، چائے پانی، مٹھائی، حقِ خدمت وغیرہ جرم نہیں ہیں، دُنیا کا ہر معاشرہ اور مذہب، بلا تفریق تحفے کو حلالِ عظیم قرار دیتا ہے، بلکہ تحفہ دینا اور تحفہ لینا قانونی طور پر نا قابلِ گرفت اور نا قابلِ دست اندازیٔ حکام ہے۔ یعنی اس پر کوئی قید نہیں ہے۔ بس تحفہ دینے والے کو نظر میں یہ رکھنا ہوتا ہے کہ تحفہ اُس کی حیثیت کے مطابق ہو، اور جس کو تحفہ عطا کیا جا رہا ہے، اُس کے پاس، اُس کا کوئی کام دھندا اٹکا ہوا نہ ہو ـــــ تحفہ لینے اور دینے سے محبت بڑھتی ہے،

ہمارے پیارے نبیؐ نے بھی تحفے کے لین دین، عیدی کے لین دین، اور تعلق داری کو بڑھانے کے لین دین کو محبت و اخوت قرار دیا ہے، اور حکمت تراشوں نے حضورؐ کی اس حدیثِ مبارکہ کے سو سو فائدے، سو سو طریقوں سے اُٹھائے ہیں، اور اُٹھائے چلے جا رہے ہیں، وہ اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اللہ اور رسولؐ کو اپنی حکمتِ عالی مقام کے سب چکر دینے میں کامیاب و کامران ہو گئے ہیں، اَب تو نہ ہی قبر میں اور نہ ہی قیامت والے دن کوئی فرشتہ اُن سے، دل سے دیئے اور محبت سے لئے تحفے کے بارے میں کسی قسم کا قانونی سوال کر سکے گا۔ یعنی یہ کہ، ناہی قانون توڑا ہے اور نہ ہی دینے والے کا دل دُکھایا ہے، اور نہ ہی اپنا حق چھوڑا ہے۔ چونکہ سب قانون کے دائرۂ عمل میں احسن طریقے سے "وائٹ وائٹ" آتا ہے تو سوال کیسے ہو سکتا ہے۔ گویا سانپ بھی مَر گیا، اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی ـــــ !

تحفوں کے لین دین سے تو محبت بڑھتی ہے، اور جب بڑھ جائے تو آدمی فرطِ محبت میں اندھا ہو کر اپنے محبوب کے لئے کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ گویا حالتِ محبت میں جب کوئی ہوتا ہے تو اُس سے عنایاتِ عظیمہ کی بارش ہوتی ہے، جو محبوب کو سرتاپاء اظہارِ محبت سے شرابور کر دیتی ہے۔ اِس میں نہ تو مُحب کا قصور ہوتا ہے، اور نہ ہی محبوب کا کوئی دخل ہوتا ہے، یہ تو فقط اور فقط محبت کا قصور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس میں اِبتلا پیدا ہو جائے، اور محبوب، یا محب، یا دونوں اس عالمِ محبت میں قتل ہو جائیں ـــــ اگر ایسا ہو جائے تو دونوں ہمارے خیال میں شہیدِ محبت کہلانے کے حق دار ٹھہرتے ہیں، اور مزید یہ کہ شہید کا ہر گناہ معاف اور دخولِ جنت، بلا پاسپورٹ ممکن سمجھا جاتا ہے؛ جس پر جنت کا ویزہ، فرشتوں سے انٹرویو کے بعد لگوانے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ بزرگوں نے اِس باب میں یہی بتایا ہے۔

تحفہ دینا بھی آسان ہے، اور لینا بھی آسان ہے، کوئی خاص قدغن اِس پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر ہم تحفہ لینے سے بیزار ہیں اور شدید نفرت کرتے ہیں تو آپ مت ہار مانیں، اور سمجھ جائیں کہ ہمارے تحفے نہ لینے کی وجہ ہماری نیک نامی اور ہاتھ میں دن رات کی تسبیح ہے۔ جب ہاتھ تسبیح میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ اتنی بھاری چیز ''تحفے'' کو پکڑا جا سکے۔ ہمارے چہرے کی وجہ ناگواری اِسی مجبوری کے تحت سمجھی جایا کرے۔ یعنی نہ ہم تسبیح چھوڑ سکتے ہیں، نا تحفہ پکڑ سکتے ہیں۔ تو آپ پریشان نہ ہوں، گھر چلے جائیں اور کہیں کہ بیگم صاحبہ، صاحب نے کہا تھا کہ یہ حقیر سا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے (حالانکہ صاحب نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا)۔ اِس موقع پر بیگم صاحبہ انتہائی ناگوار اور ناپسندیدہ انداز اور لہجے میں ''اونہہ'' کر کے منہ کو نفرت سے بائیں طرف ماریں گیں؛ ہو سکتا ہے کہ بے خیالی میں دائیں طرف بھی ماردیں، اور دھاڑ کر کے دروازہ بند کر دیں۔

آپ نے وہاں سے ہلنا یا کھسکنا نہیں ہے، مسکرا کر وہیں جمے رہنا ہے، چند منٹ بعد دروازہ دُوبارہ کھلے گا، اور ایک گوری چٹی (آپ کا نصیب بُرا ہوا تو کالی سی) نوجوان نوکرانی، جو کسی سمت سے نوکرانی سی معلوم نہیں ہوگی، ظاہر ہوگی، بڑے تپاک سے ماموں کہہ کر ملے گی، اور پوچھے گی کہ ماموں جی کیا لائے ہیں؟ تو آپ نے جھٹ سے وہ رنگین تھیلا اُس کو پکڑا دینا ہے، اور صرف اتنا کہنا ہے کہ پانی تو پلا دو۔ وہ دروازہ بند کر کے، رنگین تھیلے سمیت اندر چلی جائے گی، اور دروازہ آہستہ سے پیار کے ساتھ بند کر دے گی۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد پھر دروازہ کھلے گا ـــــ اَب دو صورتیں ہوں گی، یا تو اُس کے ہاتھ میں مسکراہٹ کے ساتھ پانی کا گلاس ہوگا، یا وہ خالی ہاتھ آئے گی، اور کہے گی کہ گھر کا فریج خراب ہے ـــــ ٹھنڈا پانی نہیں مل سکتا۔ اِس موقع

پر آپ کو اپنی عقل کے دروازے کھول کر رکھنے چاہئیں، یہ اشد ضروری ہے ـــــ خیر اگر وہ پانی کا گلاس لائے تو سمجھ جائیں کہ کام ہوگیا، اور اگر وہ فریج کی خرابی کا ذکر کرے تو آپ نے فٹ پوچھنا ہے کہ کون سے برانڈ کا فریج خراب ہوا ہے۔ وہ پھر اندر چلی جائے گی، اور آ کر بتائے گی کہ فلاں برانڈ کا ہے۔ بس آپ کا آدھا کام ہوگیا، اور آدھا باقی ہے۔ جو برانڈ اُس نے بتایا ہے اُس کی دُوکان پر سیدھے جائیں، اور نقد رقم ادا کر کے اُسے گدھا ریڑھی والے کے ہاتھ بھجوا دیں۔ اِس جادُو منتر کے بعد آپ کے سارے کام حسب منشا ہو جائیں گے۔ آپ سمجھ جائیں کہ محبت کے منتر نے کام شروع کر دیا ہے، آپ کا دِل اور رُوح مطمئن ہوں گے کہ نہ تحفہ دیا، نہ زور دیا، اللہ نے خوب فضل کر دیا، اَب کام میرٹ پر ہوگا۔ اَب آپ باقی زندگی خوشی خوشی گزار سکتے ہیں۔

نذرانہ بڑی پاکیزہ چیز ہوتی ہے۔ نذرانہ دے کر سالک کے مُرید کو یک گونہ نہیں بلکہ دو گونہ سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پیروں فقیروں نے زمانہ قدیم سے نذرانے کا رواج ڈال رکھا ہے، مگر اَب کچھ مدت سے پیر فقیر نذرانہ کم لیتے ہیں اور نقد پر زیادہ زور ڈالتے ہیں؛ مگر محکمانہ قسم کے پیر فقیر نذرانے کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اُن کے یہاں نذرانہ ایک زکوٰۃ کا درجہ رکھتا ہے، اور دین مذہب نے زکوٰۃ ہر صاحب حیثیت پر لازمی لاگو کر رکھی ہے ـــــ مزید یہ کہ اَب صورتحال اور بہتر ہوگئی ہے، وہ اِس طرح کہ پہلے زمانے میں فقط اتنی بدنامی تھی کہ محکمے کے اکثر پیر فقیر نذرانہ بصورت زکوٰۃ لیتے تھے اور اُس میں بُری طرح بدنام ہو چکے تھے بلکہ جو نہیں لیتے تھے، وہ بھی اُسی چکی میں بے دریغ پسے جاتے تھے۔ مگر اَب صورتحال قطعی مختلف ہے، وہ یہ کہ پرائیویٹ اداروں کے افسر کار خاص بیکار بھی پیری فقیری کا لبادہ اوڑھ

چکے ہیں۔ حد اس سے بھی آگے بڑھ چکی ہے، پہلے اِس پیری فقیری میں مرد حجرہ نشین ہوا کرتے تھے، مگر جناب زمانہ ترقی کرتا ہے تو اِس طرح کرتا ہے کہ اَب عورتیں بھی اپنے حجرے اور آستانے سجائے، حالت پردہ نشینی میں بیٹھی ہیں، اور خوب دل کھول کر نذرانے لیتی ہیں۔

ایک عفیفہ نیک خانم، عمر چالیس برس، عبایا قبایا اُوڑھے، ہاتھ میں تسبیح لئے ایک نجی تعلیمی ادارے کے مرکزی دفتر کی سربراہ مقرر فرمادی گئیں۔ اُن کے دائرہ کار اختیار میں اپنے فرنچائز کا انسپکشن کا نظام دیا گیا۔ بس اَت اُٹھ گئی، وہ اس طرح کہ اُنہوں نے اپنے دفتر کے کمرے کے ایک کونے میں مستقل جائے نماز بچھا دی؛ سولہ ہزار کا عبایا ہمہ وقت زیب تن کرلیا، جو کوئی آتا، دیکھتا کہ پیر صاحبہ عالمِ استغراق میں بَرسرِ مُصلّٰے براجمان ہیں، طبیعت میں سختی پیدا کرلی کہ زیادہ عبادت سے اکثر پیدا ہو ہی جاتی ہے ــــ لپ اسٹک، میک اَپ سے نفرت اور بےزاری کا اعلان کردیا کہ مانع وضو ہوتا ہے، البتہ بعد از اوقات دفتر قطعی نہیں ہوتا ــــ !

اُنہوں نے اِس سب کے بعد فقیری کا آستانہ بَرسرِ ملازمت سجالیا۔ بس فارغ اوقات میں امورِ دفتری کو خضوع وخشوع سے انجام دیتی تھیں۔ آستانے کا سجانا تھا کہ نذرانوں کی بے دریغ آمد شروع ہوگئی، اُن کے نذرانے، نیاز کا اصول نرالا تھا، نہ کسی سے کبھی مانگا، نہ طلب کیا، جو کوئی دے جائے اُس سے انکار نہیں۔ حضرت پیر صاحبہ کی لیڈی کلرک سائل کو بتاتی تھی کہ عفیفہ نیک بیگم کوئی غیر اُصولی بات پسند نہیں کرتیں، اللہ والی ہیں، جب وہ انسپکشن پر آئیں تو آپ اُن کو احترام سے بٹھائیں، ساری فائلیں ایمانداری سے اُن کے سامنے رکھ دیں، وہ بہت نرم دل کی ہیں، بس ذرا زبان کی کڑوی کسیلی ہیں، اُن سے آپ نے بحث بالکل نہیں کرنی ہے، اے سی والے

کمرے میں اُن کو تشریف رکھنے کو کہیں تا کہ عبادت کی گرمی اور حرارت اعتدال پر رہے۔ کھانا پیش کرنے میں وہ کوتاہی پسند نہیں کرتیں، فقط بکرے کا گوشت چند بوٹی تناول کرتی ہیں کیونکہ توانائی خرچ کرنے کا کام بصورت فقر بہت کرتی ہیں تو نقاہت ہو ہی جاتی ہے۔ سادہ پانی بہت پسند ہے اُن کو، مگر بعض مرتبہ برائے ہاضمہ کسی بھی مشروب کو طلب کر لیتی ہیں، سو ہر مشروب ماسوائے مکروہ و ممنوع حاضر میبل رکھیں — وہ بہت نرم دل کی واقع ہوتی ہیں، بعد از معائنہ وہ تمام فائلیں ہمراہ اپنے دفتر لا کر بچھے مُصلّے کے بائیں کونے پر رکھ دیتی ہیں، جب بھی اُن کو دو رکعت نفل پڑھ کر فرصت ملتی ہے، دستخط فرما دیتی ہیں، یہ کام وہ ایک روز بعد شروع فرماتی ہیں۔ بڑی مشہور پیرنی ہیں، آپ مشکل میں ہوں تو آپ کو وظیفہ بھی بتاتی ہیں — آپ سے درخواست ہے کہ جو وظیفہ برائے حاجت روائی وہ آپ کو تعلیم کریں، آپ نے باہر نکل کر مجھے بتانا ہے، میں اُس وظیفے کی نیاز آپ کو بتا دوں گی، نیاز دینے سے وظیفے کے مؤکل اور رُوحانی طاقتیں آپ کے ساتھ ہو جائیں گی — پوچھا عزیزہ، نیاز کس دربار میں پہنچائیں۔ فرمانے لگیں، پیر صاحب کے دربار میں، بس مجھے عنایت فرما دیں؛ آپ کا کام حسب منشا انجام پائے گا۔ سارا مؤکلی وظیفہ پیر صاحب آپ کے حق میں اپنے قلم سے خود انجام دیں گیں، آپ کو قطعی زحمت نہیں ہوگی — اگر وظیفہ نیاز کی خرابی یا کمی یا نہ ہونے کے سبب ناقص رہ گیا تو عتابِ الٰہی کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے — !

مٹھائی دینا، مٹھائی کھلانا، مٹھائی بانٹنا اور مٹھائی لانا، خوشی کی نوید کا دستور ہے۔ جب آدمی خوش ہوتا ہے تو خوشی کی علامت کا سماجی و معاشرتی اظہار مٹھائی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ دستور انسانی تاریخ میں بہت قدیم اور مستحسن شمار ہوتا

ہے۔ دستور کا مطلب ہوتا ہے آئین، اور آئین کا مطلب ہوتا ہے کہ قانون اور آئینی قانون کی بالا دستی یہ قرار دی گئی ہے کہ یہ ملک کے ہر شہری پر بلا تفریق لاگو ہوتا ہے۔ چونکہ مٹھائی کھلانا، لانا، بانٹنا اور دینا خوشی کے موقع پر آئینی دستور کا درجہ حاصل کر چکا ہے، سو اَب اِس سے نجات کسی طرح ممکن نظر نہیں آتی۔ سو بہتر ہے کہ دستور کی پاسداری نہایت احترام اور مؤدب طریقے سے انجام دی جائے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہم نے قومی سطح پر مٹھائی دینے، کھلانے اور بانٹنے کا دستور قائم رکھا ہوا ہے؛ پھر جب دستور رواج بن جائے تو مزا دوبالا اور حکمت بے کہن ہو جاتی ہے۔

وہ زمانے گئے جب خوشی کے موقع پر مٹھائی ہی بانٹی جاتی تھی۔ اَب ذرا زمانہ بدل گیا ہے۔ اَب مٹھائی کی جگہ کاغذ کے رنگین نوٹ، حسبِ توفیق بانٹے جاتے ہیں، جن کو عرفِ عام میں مٹھائی کہا جاتا ہے ___ یاد رہے کہ اَب یہی دستور، معاشرے میں، نہایت فراخدلی اور حسنِ اخلاق کے طور پر رائج ہے۔ حسنِ اخلاق سے یہاں مراد یہ لی جاتی ہے کہ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو باقی اخلاقیات کے جنازے کی تمام تر ذمہ داری صرف اور صرف آپ پر عائد ہوگی؛ اور جنازے کی تدفین وغیرہ کے انتظامات بھی آپ کو خود ہی کرنا ہوں گے۔ اَب آپ سوچیں کہ ایک مَرا ہوا آدمی اپنے جنازے کا انتظام کتنی مشکل سے کر پائے گا، کر پائے گا بھی کہ نہیں؛ یہ اُس کا مسئلہ ہے، کسی اور کا نہیں ___ مٹھائی کے طلب گار کو آپ کے اِن مسائل سے قطعی کوئی غرض یا دلچسپی نہیں۔ یہ آپ کا دردِ سر ہے، اُن کا نہیں ___ !

چائے پانی پوچھنا بھی اتفاق سے اخلاقیات کے زُمرے میں آتا ہے۔ نا پوچھنے والا معاشرے کی اخلاقیات کی کتاب میں انتہائی خود غرض، کمینہ اور نا ہنجار شخص

سمجھا جاتا ہے، اور ایسے شخص کا کوئی بھی کام کرنا کفر کے مترادف ہوتا ہے۔ اِس کمینے آدمی کو تو منہ بھی نہیں لگانا چاہیے یعنی .... آپ سے گزارش ہے کہ آپ ''منہ لگانے'' کو فحش معنوں میں ہر گز نہ لیں، یہاں منہ نہ لگانے کا مطلب ہے کہ آپ اُس کو چائے پانی نہ پوچھنے پر ''حقہ پانی'' بند کردیں۔ جیسے ہی اُس کا حقہ اور پانی بند ہوگا تو وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپے گا، کسی کل چین نہ پائے گا۔ چائے پانی کے بغیر تو گزارا ہو سکتا ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ حقے کے بغیر قطعی گزارہ نہ کر سکے گا۔ تڑپتا اور بلکتا ہوا آپ کے ''چرنوں'' میں حاضر ہوگا، گڑگڑائے گا، بالکل اُسی طرح جیسے حقہ گڑگڑاتا ہے۔ پھر آپ اُس کو لعنت ملامت کرنا چاہیں تو شوق سے کریں، وہ فوراً چائے پانی کا مطلب سمجھ جائے گا۔ اِس موقع پر یقین ہے کہ وہ فراخدلی سے کام لے گا، اور آپ کے یہاں چائے کی ندیاں اور پانی کے فوارے کھول کر عافیت پائے گا، اور اپنی رُوح میں سکون کا احساس محسوس کرے گا۔ یہ بھی کہ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ چائے پانی کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے، اور حقہ پانی بند ہونے سے بندہ کتنا بے بس، اور محتاج، اور معذور معذور سا ہو جاتا ہے۔ پھر آئندہ کبھی ایسا نہ کرنے کی جرأت کرے گا بلکہ اگر غیرت مند ہوا تو وقتِ وفات اپنی وصیت میں پہلا جملہ یہ لکھوائے گا کہ کسی کا چائے پانی بند نہ کرنا، ورنہ وہ تمہارا اور تمہاری نسلوں کا حقہ پانی بند کردے گا، اور کسی محکمے میں تمہاری شنوائی نہ ہو سکے گی۔

حقِ خدمت دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو کارِ ملازمت سے فقیر پاتا ہے، اور دُوسرا وہ جو ''کارِ خیر'' کے نذرانے کے طور پر طلب کیا جاتا ہے۔ جب یہ دونوں ایک ہی وقت میں طلب کیے جائیں تو ''حقِ خدمت'' کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔

حقِ خدمت کا لبادہ زیب تن کرتے ہی اُس میں نرالا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس عمل کو سادے لفظوں میں بعض لوگ "مالک" اور "مسائل" سے مل کر ٹھگی لگانا بھی کہتے ہیں، جو سراسر ناانصافی اور ظلم کے زُمرے میں آتا ہے۔

اصل میں حقِ خدمت اُن کا وہ حق ہے، جس کو کوئی قانون، شرع اور اخلاقیات وصول پانے سے نہیں روکتی۔ جب آپ کسی کا کام، اُس کے مطالبے پر کر رہے ہیں ہوں تو خدمت گزار کا حق وصول پانا اور اُس کو سائل کا ادا کرنا اخلاقی فریضہ ہے۔ ہم اِس اصول کے تحت اپنا حقِ خدمت دھڑلے سے سرِ بازار لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کام نہیں کرتے تو نہیں لیتے ـــــ ہم کوئی چور، اُچکے، ڈاکو، لٹیرے تو ہیں نہیں کہ ہر کسی سے اُس کا مال لُوٹ لیں۔ توبہ توبہ ـــــ نعوذ باللہ ـــــ لعنت ہو ایسا کرنے والے پر ـــــ بھائی ہم جب اتنا وقت اپنی نوکری کے وقت سے نکال کر، بھاگ بھاگ کر، فائلوں کی پرانی جراثیم آلود مٹی میں نہا کر کسی سائل کا کام، اُس کی مرضی اور تسلی کے مطابق کر کے دیتے ہیں تو اِس خدمت کا حق وصول کرنا ہمارا ابھی پہلا حق ہے۔ اِس میں بُرائی کیا ہے، ذرا بتائیں نا مجھے ـــــ میں نے کہہ دیا کہ بُرائی کا تو مجھے پتہ نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ کوئی آپ کو اِس اَمر کے انجام دینے کی ماہوار تنخواہ بھی دیتا ہے، جس کے عوض لوگوں کے کام انجام دینا ہوتے ہیں ـــــ یہ بات سُن کر وہ جل بھُن گیا، فائل اُٹھا کر دیوار میں ماری، منہ سے سفید جھاگ باچھوں کے کناروں پر آ گیا، اور دیوار میں فائل کے لگنے سے گرد و غبار کا طوفان برپا ہوا، اور وہ آخری جملہ بولا ـــــ تو جاؤ یہ کام اُن سے کرا لو ـــــ یہ جملہ سننا تھا کہ میں لاچار ہو گیا، میرے غبارے سے خدمت کی ساری ہوا نکل گئی، اور حق آنکھوں کے سامنے چھچھوندر بن کر ناچنے لگا۔ ہم نے منتیں کر کے اُن کو دوبارہ راضی کیا، اِس گناہِ عظیم کا کفارہ اُن کے

موبائل کا پیٹ بھر کرادا کیا، بچوں کے لئے ڈھیر سارے پھل خرید کر دیئے، بیگم صاحب کے لئے ایک سُوٹ مبلغ چار ہزار کی مالیت کا اپنی بیگم کی طرف سے تحفے میں دیا، موٹر سائیکل میں پانچ لٹر پٹرول ڈلوایا، منت سماجت کر کے حقِ خدمت اُن کو وافر مقدار میں کہ جس سے طبیعت ہلکی اور مزاج میں ہلکا پن پیدا ہو، ادا کیا۔ تب جا کر ہم نے سکونِ قلب پایا، گھر آ کر شکر کی کئی نمازیں گڑگڑا کر پڑھیں۔

حضراتِ گرامی قدر ــــ یہ سب عطاء کے ذیل میں آتا ہے، اور عطا کی صورت حال آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ یہ وہ عطائیں ہیں کہ جس میں حسنِ سلوک ہی حسنِ سلوک ہے۔ یعنی یہ کہ عطا کرنے والا مردُود اور عطا پانے والا مستحق قرار پاتا ہے۔ دینے والا شرمندہ، اور لینے والا فخر و ابناء کا مالک دکھائی دیتا ہے، جو جرم پر اُکساتا ہے، وہ مظلوم اور ضرورت مند بن جاتا ہے، اور سائل جو مبتلائے غم و اندوہ ہے، وہ شرمسار ہے ــــ واہ کیا دستور ہے جو رواج پا گیا ہے ــــ !

شکاری

یہ ایک بے رحم اور مہم جوئی سے بھرا ایک دلچسپ کھیل ہے، جو اِس وقت ہمارے معاشرے میں بہت تیزی سے پروان چڑھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اعتراض ہو اور آپ اِس کو کھیل نہ سمجھتے ہوں۔ مگر یاد رکھئے جو اِس کو کھیلتے ہیں، بطور کھیل ہی کھیلتے ہیں۔ چونکہ آپ سمجھتے نہیں اس لئے اشد ضروری ہے کہ اِس کھیل کے اصول و قواعد سے آپ کو آشنا کیا جائے۔ کیونکہ جب تک کسی کھیل کے اصول معلوم نہ ہوں، اُس وقت تک کھیل سے آدمی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بڑی بدمزگی محسوس ہوتی ہے، کھلاڑی کو بھی اور تماشائی کو بھی۔ سو ضروری ہے کہ تماشائی اور کھلاڑی کھیل کے

رمز و کنائے سے حتی المقدور اور حسب لطف آگاہ ہوں۔

اِس کھیل میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موت فقط مخالف پارٹی یا تماشائی کی ہوتی ہے۔ آج تک تو سنا نہیں کہ خدانخواستہ کھیلنے والا شکاری مارا گیا ہو، یا مار دیا گیا ہو۔ ہاں البتہ یہ بات روز سننے میں آتی ہے کہ مخالف پارٹی اپنی کوتاہ بینی، بلاوجہ کی ہٹ دھری، ہوشیاری، چالاکی اور حماقت سے ماری گئی۔ کبھی یہ سننے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا کہ کھیل کا مرکزی کھلاڑی یعنی شکاری اپنی جان گنوا بیٹھا ہو ___ ہاں، کئی سال گزرے، سنا تھا کہ ایک شہر میں، شاید کراچی میں، ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے، شکاری مارا گیا، جس پر شہر میں شدید واویلا ہوا، بات بڑھتے بڑھتے میڈیا تک جا پہنچی ___ میڈیا نے بھی وہی کہا جو مقتول شکاری کے ساتھی اور اہلِ خانہ و اہلِ محلہ بیک زبان کہہ رہے تھے کہ بے چارہ فقط اُنیس سال کا تھا، نہایت ہونہار اور دانش مند بچہ تھا، مسجد میں باقاعدگی سے نماز پڑھنے جایا کرتا تھا ___ اتفاقِ زمانہ دیکھئے کہ ہمیں اُسی محلے میں کسی عزیز کی دعوت پر جانا پڑا ___ پھر جو حالات، اُس ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے آنکھوں دیکھنے اور سننے کو ملے، وہ کچھ یوں تھے کہ ہونہار مسجد ضرور جاتا تھا، مگر جس روز وہ مسجد میں نماز کو جاتا، اُس دن آدھے نمازیوں کے موبائل فون، بٹوے اور گھڑیاں غائب ہو جاتی تھیں۔ دانش مند اِس قدر تھا کہ کبھی کسی کے ہاتھ نہ آیا تھا۔ ہونہار اتنا تھا کہ کبھی عمارت سرکار برائے مجرمان میں دوستانہ حاضری لگائے بغیر گھر نہ آتا تھا۔ یاد رہے کہ وہ وہاں روزانہ رات کو صرف سلام کرنے جایا کرتا تھا، جرم یا اقدامِ جرم سے اُس کا ہرگز کوئی دُور یا نزدیک کا تعلق نہ تھا، بہت معصوم اور پیارا بچہ تھا۔ کچھ ناراض اور نانجار اہلِ محلہ کا خیال تھا کہ وہ گھوڑا، جس کو خاص حالات میں طمنچہ کہتے ہیں، دن رات، بہ غرضِ حفاظت اپنے نیفے میں اُڑس کر رکھتا تھا۔ یہ خاص طرح کا نیفہ تھا، جو اُس

کی بہن نے والدہ صاحبہ کے مشورے سے سی کر تیار کیا تھا۔ کہتے ہیں اُس کی سلائی میں والدہ محترمہ کا پچاس سالہ تجربہ اور بہن کا اٹھارہ سالہ تجربہ شامل تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ والد صاحب کو تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا؛ وہ تو بہت نیک اور پارسا آدمی ہیں، اُنہیں پتہ ہوتا تو مار مار کر چمڑی نہ اُدھیڑ دیتے۔ حیرت ہے کہ گزشتہ پانچ برس سے وہ اِس مشغلے سے وابستہ تھا، سارے گھر اور محلّے کو پتہ تھا ــــ نہیں پتہ تھا تو اُن کو نہیں پتہ تھا۔ ہم نے کافی غور و فکر کے بعد نتیجہ نکالا کہ شکاری ہو تو ایسا ہو، ورنہ نہ ہو ــــ!ــــ البتہ ایک بندہ جو چہرے مہرے سے وحشی اور ملازم سا لگتا تھا، بس رو، رو کر یہی کہے جا رہا تھا کہ ــــ جا تیرے مرنے سے ہم بھی اُجڑ گئے، اور تھانہ بھی برباد ہو گیا ــــ! کسی نے بتایا کہ یہ اُس لونڈے کا مامّا ہے ــــ پوچھا ــــ سگا ــــ؟ کہا نہیں، بنا ہوا ہے ــــ!

یہ کھیل بڑا وحشی کھیل ہے۔ اِس کو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے۔ اگر موٹر سائیکل 125CC کا ہو تو کھیل کا مزا آجاتا ہے ــــ جی نہیں ــــ آپ غلط سمجھ رہے ہیں، ہم موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے کی بات بالکل نہیں کر رہے، کیونکہ عموماً موت کے کنویں میں اکثر ایک حسین لیڈی، چست اور باریک لباس، سر سے پیر تک زیب تن کر کے موٹر سائیکل چلایا کرتی ہیں۔ ایک صاحب موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی، چست لباس حسینہ کے آٹھ کے آٹھ شو روزانہ دیکھا کرتے تھے؛ اُنہوں نے بتایا تھا کہ اُس وقت بہت مزا آتا ہے جب وہ مہ جبیں آپ کے پاس سے اِس طرح گزرتی ہے کہ آپ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوٹ وہ اپنے ہونٹوں سے لپک کر اُچک لے جاتی ہے، اور مجال ہے کہ اُس کا ہونٹ آپ کی اُنگلیوں کے پوروں کو چھو جائے۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ صاحب روزانہ آٹھ شو اُس قاتل ادا

کے یوں دیکھتے تھے کہ کسی نہ کسی دن تو اُس کے سُرخ ہونٹ اُن کی اُنگلیوں سے چھو ہی جائیں گے ـــــ بس یہی حال اِس کھیل کا بھی ہے۔ یعنی جو اپنا موبائل فون دینے سے اِنکار کرے اور فاؤل کھیلنے پر آجائے تو اُس کے بھیجے میں شکاری ایک لمبا سُوراخ کر دیتا ہے۔ گویا ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔

اِس کھیل میں موٹر سائیکل چلانے کے آداب بہت کڑے ہیں، جن پر آپ کی کامیابی کا مکمل انحصار ہوتا ہے۔ معاف کیجئے گا آپ کی نہیں، یہ موبائل ڈکیت صاحب کی بابت کہا جا رہا ہے، آپ اور میں تو صرف تماشائی کھلاڑی ہیں۔ آپ کی کوئی بھی کوتاہی آپ کو زندہ در گور کر سکتی ہے، جس کی معافی شکاری کبھی نہیں دیتا۔

موٹر سائیکل چلانا سیل فون ڈکیتی کا سب سے بڑا ایڈونچر ہے، اور مشکل یہ درپیش ہے کہ ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جو اِس مقصد کے لئے شریفانہ اور ماہرانہ طریقے سے موٹر سائیکل چلانے کی باقاعدہ تربیت دیتا ہو، اور اِس کے دیگر اضافی کورسز کا ہمہ گیر انعقاد کرتا ہو؛ سو یہ کام شکاری کو خود ہی کرنا ہے، چونکہ یہ کام ذرا سا غیر محفوظ ہے۔ اِس لئے یاد رکھا جائے کہ کوئی انشورنس کمپنی یہ کاروبار بتانے پر زندگی کا بیمہ نہیں کرتی۔ ہاں البتہ اگر والدِ محترم ہمراہ کاروبار ہوں تو انشورنس، ایکسیڈنٹ رسک کے ساتھ بھی ممکن ہے؛ جس کیلئے بتانا ہوگا کہ لڑکا سپیڈ سیلز مین ہے۔ یاد رکھئے اِس کام میں جس کسی کی بیمہ پالیسی مُؤثر ہے اُس کی دلیریاں اور پھرتیاں دیکھنے والی ہوتی ہیں۔

حصولِ موٹر سائیکل 125CC اِس کاروبار کے لئے سب سے اعلیٰ اور قابلِ اعتماد مانا گیا ہے۔ اگر شکاری کے پاس اپنا نہیں ہے تو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ماموں، پھوپھا، خالو کا پکڑ لیں۔ اگر اماں کو بھی اعتماد میں لے لیا ہے تو کسی کی جرأت نہیں کہ واپس مانگے۔ اگر کسی محلے دار، رشتے دار کے پاس بھی نہیں

ہے تو کسی ماہر اور اچھے سے مخلص دوست نما جوڑی دار کی مدد سے اغوا کرلیں، چوری کرنا منع ہے۔ ہاں البتہ اغوا کے بعد آپ کا عزیز جوڑی دار اُس کا نمبر بدل دے گا۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ قبل از اغوا، نمبر پلیٹ پہلے سے بنوا کر محفوظ کرلیں، پھر نمبر بدل کرائے اُڑے پھریں۔ اس لئے کہ ہمارے ملک میں نمبر پلیٹ، انجن نمبر سے اور چیسی نمبر سے سرِ راہ نہیں ملایا جاتا اور نہ اُس کا کوئی انتظام اور رواج ہے۔ جو لیپ ٹاپ سرکار نے اِس کام کے لئے حکام کو دیئے تھے، وہ کبھی کے سکریپ ہو کر بک چکے ہیں، لہٰذا موجیں ہی موجیں ہیں — ہمیشہ پچھلی نمبر پلیٹ نرم لوہے کی چادر سے بنوائیں۔ اِس کی وجہ بعد میں بیان کی جائے گی تو آپ دنگ رہ جائیں گے اور خوشی سے دیوانے بھی ہو سکتے ہیں۔

شکاری اِس موٹر سائیکل کو مندرجہ ذیل قواعد کے مطابق چلانے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ پیر چھنن شاہ کوراوی کی بیلے والی بارہ دری میں اُن کی قبر کو سلام کرنے جاتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر چرس خریدنا لازمی ہے، ہو سکتا ہے کہ دو چار چکروں میں وہاں شکاری کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جائے جو اُس کو رموزِ قانون میں براہِ راست مدد دینے کا یقین دلا دے۔ جب یہ اپنا دستِ شفقت شکاری کے سر پر رکھ دے گا اور ہر طرح کی ہر موقع پر قانونی امداد کا یقین دلا دے تو سمجھ لیں کہ پیر چھنن شاہ نے آپ کی مُراد قبول کر لی ہے، اَب شکاری کو پیر چھنن شاہ کے مزار پر ہر روز آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس مُراد کے پورے ہونے کی نشانی یہ ملتی ہے کہ اَب چرس شکاری کو اُس کے گھر کی دہلیز پر مناسب داموں خالص ملا کرے گی۔ شکاری کو پتہ ہونا چاہئے کہ چرس کی سبز پُڑی جب پھیپھڑوں سے دماغ تک پہنچتی ہے تو بزدل سے بزدل بھی شیر، بہادر اور دلیر بن جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ وگین

ڈرائیور، رکشہ ڈرائیور اور چن چی والے کس دلیری سے چلاتے ہیں کہ اتنی بڑی گاڑی سوئی کے ناکے جتنی جگہ سے بھی گزار دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ بعض کاروں والے بھی اس فعل پر قادر ہوتے ہیں۔ اس میں اُن کی مہارت کا کم اور چرس کی دلیری کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہمارے یہاں سڑکوں پر ڈوپ ٹیسٹ کا کوئی انتظام نہیں ہے، اس لئے خیر ہی خیر ہے۔

ڈرائیونگ کے پہلے مرحلے میں شکاری نے کسی ایسی بڑی سڑک کا انتخاب کرنا ہے، جو کافی چوڑی چکلی ہو، اور قدم قدم پر دائیں بائیں اُس سے ذیلی سڑکیں گلیاں شاخوں کی طرح نکلتی ہوں۔ اس کے فوائد بعد میں بتائے جائیں گے۔ اَب شکاری نے بڑی سڑک پر اُس وقت اپنا موٹر سائیکل دوڑانا سیکھنا ہے کہ جب سڑک بھری پڑی ہو؛ کسی گاڑی یا موٹر سائیکل کی رفتار بیس سے زیادہ نہ ہو۔ ایسے میں شکاری اپنی نوجوانی اور چرس کے نشے سے مشترکہ طور پر کام لیتے ہوئے، اس سڑک پر چالیس، پچاس کی مناسب رفتار پر اپنا ہوائی گھوڑا، زِک زیک میں اس طرح بھگائے کہ پوری سڑک کی ٹریفک خوف زدہ ہو جائے، ہارن بجانا ممنوع ہے؛ بجلی کی طرح کبھی نیچے والی لائن، کبھی اُوپر والی لائن، اور کبھی درمیان والی لائن میں گھستا چلا جائے۔ گویا جہاں سینگ سمائیں، وریغ نہیں کرتا، اور ایک منٹ کے اندر اندر ایک کلو میٹر سفر طے کر لیتا ہے، جبکہ باقی گاڑیاں شکاری کو بچانے کے لئے مدتوں اپنی جگہ جمی کھڑی ہو جائیں گی۔ جب شکاری اس زِک زیک میں موٹر سائیکل چلانے کے لائق ہو جائے تو اَب دُوسرا مرحلہ شروع ہوگا ــــ دُوسرے مرحلے کے لئے اگر چرس چرات کے دو سگریٹ پی لئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ شکاری کے جوانی بھرے خون میں مل کر عجیب سرُور دیں گے۔ اَب ہو گا یہ کہ شکاری زِک زیک

ڈرائیونگ میں اپنے بائیں ہاتھ کے ماہر ہو چکے ہوں گے۔ یاد رہے کہ اس عمل کی تکمیل میں چار پانچ روز لگیں گے، ہاں اگر چہ س چراٹ خالص اور اچھی نسل کی ہوئی تو یہ مرحلہ تین دن میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ اَب کرنا یہ ہوگا کہ جب شکاری اپنے ہاتھ کی سڑک کے زِگ زیگ کا ماہر ہو جائے تو اچانک چلتے چلتے اُسی سڑک پر واپس مُڑ جائے، یعنی ون وے کے خلاف۔ ڈریں نہیں، کچھ نہیں ہوگا، قوم سو رہی ہے، سب لوگ اُس کو راستہ دیں گے، یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے کہ نوجوان کی ماں بیمار ہو اور وہ اُس کے لئے دوائی لے کر جا رہا ہو ـــ ہمارے ملک کا آج کل یہی دستور ہے۔ پولیس والے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ـــ بلکہ اُس کی پرواہ بھی نہ کرے۔ کیونکہ وہ ٹریفک کے بہاؤ میں اپنا بائیک چلانے کا عادی ہے؛ وہ ٹریفک کے بہاؤ کے خلاف بائیک چلانے کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ سو اطمینان ہی اطمینان ہے، بے فکر رہیں، کوئی مائی کالال شکاری کو نہ روکے گا، نہ ٹوکے گا، نہ کچھ بگاڑ سکے گا، بس منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ اگر کوئی شکاری کی اِس حرکت پر اُس کو گالی دے تو رکھ کر ایک چانٹا اُس کے منہ پر رسید کریں، اِس میں کوئی دشواری نہ ہوگی، کیونکہ اُس کا منہ شکاری کے مقابل ہوگا اور بس نکلتے چلے جائیں، وہ شکاری کے پیچھے کبھی نہیں آ سکے گا، کیونکہ اُس کا موٹر سائیکل اُس ٹریفک میں پھنس چکا ہوگا اور ون وے پر تیزی سے مُڑ بھی نہ سکے گا، تو پیچھے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیجئے صاحب، اَب شکاری کے اسباق بنام موبائل ڈکیتی کے تین کورس کامیابی سے مکمل ہو گئے ہیں۔ شکاری ماہر ہو چکا ہے کہ نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ پکڑ سکتا ہے، نہ پیچھے آ سکتا ہے ـــ آج پھر شکاری پیر چھنن شاہ کے دربار پر حاضری کے لئے جائے گا اور ساتھ میں اپنا گھوڑا یا طمنچہ، پتاخوں سمیت لے کر حاضری دے

گا۔ طمنچے کو پیر صاحب کے مزار پر بڑی چادر سے رگڑ رگڑ کر برکت حاصل کرے گا اور بناخوں کی تھیلی کو بھی قبر مبارک پر لیٹا لیٹا کر مس کرے گا، جیسے کوئی ملنگ تڑپ تڑپ کر حال کے عالم میں قوالی سُنتا ہے۔ بس کام ہو گیا، واپسی پر دستِ شفقت والے صاحب کے دفتر میں سلام کے لئے حاضری دے گا، اور اُن کو بتائے گا کہ آپ کی آشیرباد لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ وہ فوراً بیعت لیں گے اور شکاری سے کہیں گے کہ بیٹا پہلی کامیابی پر سیدھے یہاں آنا اور نیاز دینا، اور کبھی نیاز دینے کا عمل ترک نہ کرنا، ورنہ اِس کی سزا بہت زیادہ ہے۔ شکاری بعد از بیعت پکا وعدہ کرے گا۔

لیجئے صاحب! ساری ٹریننگ مکمل ہو گئی ہے۔ نذر و نیاز، آشیرباد بھی ہو گئے ہیں۔ اَب شکاری اپنے اُس دوست کو بلائے گا جو شکاری کا اوّل دن سے جوڑی دار تھا۔ شکاری نے مہم جوئی کے دوران پینٹ شرٹ پہننی ہے جبکہ شلوار قمیض جوڑی دار پہنے گا۔ اُس کو مہارت ہونا چاہئے کہ وہ عین اُس وقت چلتے موٹر سائیکل سے طمنچے کو لے کر اُتر جائے اور معصوموں کی طرح چلتا ہوا ساتھ والی گلی میں ٹہلنے کے اندازِ بے فکری سے داخل ہو جائے کہ جب سامنے غلطی سے ناکہ سرکار آ جائے تو —— دُوسرا کام اُس کا یہ ہو گا کہ جب بھی وہ بائیک پر بیٹھے تو نرم لوہے کی چادر والی نمبر پلیٹ کو اُوپر کی طرف موڑ دے تا کہ نمبر نظر نہ آ سکے، حالانکہ وہ جعلی نمبر ہے۔ یاد رہے کہ جعلی نمبر کی حفاظت منکوحہ نمبر سے زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ دُوسرے یہ کہ اپنی قمیض کا پچھلا دامن، اِس کے باوجود پلیٹ پر گرائے رکھے، جیسے کہ باپردہ دوشیزہ نے نقاب منہ پر ڈال رکھا ہو، اور آئس کریم عقبِ نقاب نیچے کی سمت سے اُوپر کو کھا رہی ہو —— !

اَب شکاری پہلا اور آخری اصول پہاڑے کی طرح پانی یاد کرے کہ ہمیشہ واردات کر کے ون وے کے خلاف جانا ہے۔ بس اَب کوئی شخص اور نہ کوئی پولیس والا

شکاری کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا، بس منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور شکاری ہوائی گھوڑے پر سوار، دُور کہیں پریوں کے دیس میں سکون سے مُجرا سُن رہے ہوں گے۔

پہلا تجربہ شکاری نے پرس چھین کر کرنا ہے۔ اِس ریفریشر کورس سے شکاری کے دل میں توانائی اور بڑا پن اُس وقت پیدا ہوگا، جب اُس کو فرار ہوتے ہوئے محترمہ کی دل دوز چیخیں سُنائی دیں گی۔ شکاری نے نہ تو مُڑ کر دیکھنا ہے اور نہ ہی اپنے دل پر کوئی اثر لینا ہے۔ بس زیادہ خطرہ محسوس ہو تو طمنچہ نکال کر ہوا میں اُس کی طرف بے باکی اور دلیرانہ جرأت سے لہرانا ہے، پٹاخہ بالکل نہیں چلانا اور ساتھ والی گلی میں مُڑ کر ہوا ہو جانا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلاً ـــــ !

نیز شکاری کے لئے ہلمٹ بہت ضروری ہے تاکہ کوئی شکل نہ پہچان سکے اور جوڑی دار کے لئے پرنا ـــــ !

یاد رکھیں! جعلی طمنچہ سے کبھی یہ کارِ خیر انجام نہ دیں۔ پیر چھنکن شاہ بھی دھوکے بازی کرنے والے سائل سے شدید بے زار ہوتے ہیں، اور ہاں بعض لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں، فٹ پہچان جاتے ہیں، مگر اِس اسکول کی کتاب اور گائیڈ بک میں (جو پیر چھنکن شاہ کے دربار سے عام ملتی ہے) واضح طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ شکاری جو کس اور شکار ہمیشہ گھبراہٹ کا شکار ہوتا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی اصل نقل میں فرق کر پاتا ہے، مگر اصل بات یہ ہے کہ اگر کہیں رکاوٹ پیدا ہو جائے یا شکاری سمارٹ بننے کی کوشش کرے تو فقط اصلی طمنچہ ہی کام آتا ہے۔ جعلی طمنچہ شکاری کو مروا دے گا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ شکاری کو گھبراہٹ کے عالم میں شکار کا کام تمام کرنا پڑ جائے: اِس کے لئے سب سے عمدہ جگہ شکار کا ماتھا قرار دیا گیا ہے۔ دل والی جگہ مناسب نہیں ہے، شکار بچ بھی سکتا ہے ـــــ شکار کے لئے اُس وقت محفوظ رہنے کا سب سے اچھا

طریقہ یہ ہے کہ شکاری جو مانگے اُسے دے دیں اور خود دیوار کی طرف منہ کر کے اُلوؤں کی طرح پارک ہو جائیں۔ انشاء اللہ بال بھی بیکا نہ ہوگا، شکاری سے بہت پیار کے ساتھ بات کریں، جیسے وہ آپ کی محبوبہ کا فرزند یا بھائی ہے۔ روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے، گئی جان پھر نہیں آتی ___ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، ورنہ جان بدن کو چھوڑ جائے گی، اور پھر پلٹ کر کبھی نہ آئے گی ___ !

ہم نے سارے کام کیے مگر اِس بات پر تو غور کیا ہی نہیں کہ یہ کام کیوں کر کیا جاتا ہے۔ تو جناب پتہ چلا کہ بہت سے نوجوان گھر کی ناقص تربیت اور ہوس کاری کے سبب اِس دھندے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ کئی یہ کام شوقیہ کرتے ہیں، یہ مالدار گھرانوں کے فرزندان ہوتے ہیں، خصوصاً جن کے رشتے دار اعلیٰ انتظامی عہدوں پر ہوتے ہیں۔ کئی مُجرے سننے اور نشہ کرنے کے لئے اِس کاروبار سے منسلک ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ماں باپ کے کالے کرتُوت دیکھ کر اِس راستے پر آ جاتے ہیں۔ کئی محبوبہ کے حسن و جمال سے فیض یاب ہونے کی انمول خواہش میں اِس راہ آتے ہیں، اور شکاری بن جاتے ہیں کہ محبوبہ نے اچھے سے موبائل یا پرس کا مطالبہ کیا تو اُس کے عشق میں میاں نوجوان نے یہ راہ پکڑ لی۔ غرض اور بھی بہت سی وجوہات ہیں کہ جن کا مزید ذکر یہاں مناسب نہیں ہے؛ آگے ہی کافی رازہائے درونِ خانہ کا پردہ فاش کر چکے ہیں۔

ادارہ سرکار انتظامی امور اِن شکاریوں کو ہمیشہ موبائل چور کہتا ہے۔ چور قانون کی اصطلاح میں وہ ہوتا ہے جو اُٹھائی گیرا ہوتا ہے۔ آنکھ بچائی اور کام کر دیا، جبکہ ڈکیت وہ کہلاتا ہے جو بزورِ اسلحہ و طمنچہ یہ کارہائے ناک انجام دیتا ہے، اور چونکہ موٹر بائیک پر بلا طمنچہ اِس کام کو انجام دینا ممکن نہیں ہوتا، اِس لئے ہمارے نزدیک وہ

ڈاکو کے زمرے میں آتا ہے، مگر ادارہ سرکار انتظامی امور کا افسر ہمیشہ اپنے پرچے میں اُس کو چوری کے ذیل میں لکھتا ہے۔ اِس لئے کہ پیر چھنن شاہ نے یہی تعلیم کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعد از طبع آزمائی شکاری کیونکر عمارتِ سرکار میں سلام کرنے اور نیاز دینے جو جاتا ہے ___ موبائل کا مطلب ہے حرکت، موٹر سائیکل موبائل ہوتی ہے، اور ڈکیتی قابلِ دست انداز سرکار۔ اِس لئے اِس کو ہر دو معنوں میں موبائل کا نام دیا جانا نہایت مستحسن ہے۔ جو ایسی وحشیانہ ڈکیتی کو چوری کا نام دیتے ہیں، سمجھ لیا جائے کہ وہ بیعت لے چکے ہیں۔ اور جو ایسا کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور نیک پارسا بچہ قرار دیتے ہیں، وہی اصل میں معاشرے کے حقیقی مجرم ہیں۔ یہ سرپرستی زیادہ تر ایسے مجرموں کو اُن کے اپنے گھر سے ملتی ہے۔ اِس لئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اولاد جرائم کا دھندا کرے اور ماں باپ کو علم نہ ہو ___ جب کسی پولیس مقابلے میں یہ بدکردار مر جاتا ہے تو میڈیا کو بلا کر، رو کر، زولا ڈال کر نیکیاں گنوائی جاتی ہیں، جس نشریاتی ادارے کو سرپرستی کرنا ہوتی ہے، وہ بڑھ چڑھ کر اُس کی پارسائی کے قصے بیان کرتا ہے، کہ ادارہ امور انتظامی اپنے آپ کو بے بس اور محتاج محسوس کرنے لگتا ہے ___ بس یہی ہمارے آج کے دور کا المیہ ہے، جس میں ہم سب کسی نہ کسی طرح شریک ہیں، پر نادم نہیں ہیں۔

لارنس کے میلے

لاہور شہر کے عین وسط میں ایک درختوں بھرا، نہایت خوبصورت اور دل رُبا باغ ہے، جو ایک صدی سے زیادہ عرصے سے قائم ہے۔ مزے دار اور سب سے دلچسپ اور تاریخی بات یہ ہے کہ ابھی تک محبت وسلامتی کے ساتھ قائم ہے۔ سینکڑوں ایکڑ پر اس سرسبز باغ کا احاطہ ہے۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر اگر لاہور شہر کو اُوپر فضاء سے دیکھا جائے تو فوراً صاف نظر آتا ہے، جیسے پتھروں کے درمیان حسین سبز زمرد پڑا ہو۔ یہ بات اس لئے بھی کہ لاہور جو کبھی باغوں کا شہر ہوتا تھا، اب کنکریٹ کا شہر بن چکا ہے۔ اس کے وسط میں اتنے حسین باغ کی موجودگی بعض مرتبہ حیرت زدہ کر دیتی

ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ باغ قیامِ پاکستان کے بعد تک سر جان لارنس کے نام پر لارنس گارڈن کہلاتا تھا — پھر قومی سطح پر اکابرین کو خیال آیا کہ انگریزوں سے ہمیں کیا لینا دینا، اور کیا رشتہ ناطہ تو نیا نام بانیٔ پاکستان کے نام پر محبِ وطن لوگوں نے "جناح" رکھ دیا، یعنی "باغِ جناح"۔ اس میں ایک گوشہ محمد علی جناحؒ کی عزیزہ ہمشیرہ فاطمہ جناحؒ کے نام پر بھی موسوم کر دیا گیا، مگر درجنوں سال کے دوران ایک بھی تقریب اِن عظیم ہستیوں کی ولادت یا شہادت کے موقع پر یہاں منعقد نہیں ہوئی۔ حد یہ کہ باغ کے جس حصے کے جس مقام پر محترمہ مادرِ ملّت فاطمہ جناحؒ صاحبہ نے صدارت فرمائی تھی، وہاں بھی کوئی یادگاری تختی، آنے والی نسل کے لئے بطور تاریخ نصب نہیں کی گئی۔ کیونکہ ہم نام رکھ کر احسان اُتار چکے ہیں۔ اَب مزید یاد کرنے یا کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ نام رکھ دینا ہی بڑی بات ہے، یہی ہمارا خیال ہے — ارے ایک وضاحت کرنا تو ہم بھول ہی گئے کہ ہم نے گزشتہ سطور میں حضرت قائدِ اعظمؒ اور مادرِ ملّت فاطمہ جناحؒ کی وفات حسرت آیات کو شہادت کہہ دیا۔ حضور نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اگر آپ دستیاب تاریخی شواہد کی روشنی میں اِن دونوں وفادارانِ پاکستان کی موت کے اسباب پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شہید کیے گئے تھے، اپنی طبی موت سے ہمکنار نہیں ہوئے تھے۔

باقی جو بات لارنس اور باغِ جناح کے بارے میں اُدھوری رہ گئی، وہ یہ ہے کہ پینسٹھ سال میں قوم لارنس گارڈن کو باغِ جناح نہیں کہہ سکی تو وہ آگے کیا کہے گی۔ سو عوام میں مقبول نام اَب بھی لارنس ہی ہے۔ بس فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ اَب لارنس کے ساتھ باغ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ فقط لارنس کہہ کر باغ مُراد لیا جاتا ہے۔ چونکہ زبانِ خلق، نقارۂ خدا ہوتی ہے، سو ہم نے بھی فقط عوامی شعور کے استحکام اور جمہوری

روایت کو پیشِ نظر رکھ کر اسے فقط "لارنس" ہی سے مخاطب کرنا مناسب سمجھا ہے۔ بے شک اِس کو احتجاج اور ماتم تصور کیا جائے، اتنا ہی کافی ہے۔

یہ باغ جو سینکڑوں ایکڑ زمین پر بنا ہوا ہے، عین شہر کے وسط میں ہے۔ ایک طرف شاہراہِ قائدِ اعظم یعنی مال روڈ ہے، دُوسری طرف ایوانِ صنعت وتجارت والی سڑک ہے، تیسری طرف اَب بھی لارنس روڈ ہے جو ابھی تک لارنس روڈ ہی کہلاتی ہے، چوتھی جانب شاہراہِ فاطمہ جناح ہے، جس پر تھانہ ہے۔ یہ ایسی سڑکیں ہیں کہ جن پر ایک ایک مرلے کی قیمت کروڑوں روپے بیان کی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں بھی یہ باغ قائم ودائم ہے، اللہ اِس کو قائم ہی رکھے، نظرِ بد سے محفوظ رکھے، یہی دِلی دُعا ہے — یہ بات اِس لئے کہی ہے کہ اِس حسین باغ کے قدیمی درختوں پر رہنے والے پرندوں کا کیا بنے گا جو یہاں ڈیڑھ صدی سے رہ رہے ہیں، اگر ویرانی اِس باغ کا خدانخواستہ راستہ دیکھ لے تو باغ جناح کی اُن چمگادڑوں کا کیا ہوگا جن کی یہ سوسال سے جنم بھومی ہے۔ علاوہ ازیں اُن عاشقوں اور معشوقوں کا کیا ہوگا جو یہاں محبت کا سبق پڑھتے ہیں، اور عشق کے قاعدے کو ادب واحترام سے سنبھالے ہوئے ہیں۔

اِس باغ میں آ جاؤ تو اِس کے بڑے رُوپ نظر آتے ہیں۔ ہر رُوپ دُوسرے سے نرالا اور حسین تر ہے، اور اپنے حسن کے بے پناہ جلوے اور جوبن سے اپنی جوانی کی بہار دیکھا رہا ہے۔ کہیں سرسبز میدان ہیں جو اعلیٰ اور نفیس گھاس سے آراستہ ہیں؛ دیکھو تو آنکھوں کو تراوٹ اور دِل کو رُوحانی سرُور ملتا ہے۔ کہیں اُونچی نیچی سبزے سے آراستہ پہاڑیاں سلسلہ در سلسلہ ہیں کہ اُن پر بلند وبالا ملک ملک کے درختوں کے جنگل آباد ہیں، اور پھر اُن میں جنگلی انداز کی خودرَو پگڈنڈیاں، دُلہن کی مانگ کی طرح خوش رنگ نظر آتی ہیں، دائیں بائیں لگے پھول اُن پگڈنڈیوں کے

ماتھے کا سندھور ہیں، کہ انھیں دیکھ کر اور اُن پر چہل قدمی کر کے رُوحانی مسرّت کا سُرور حاصل ہوتا ہے۔

اگر کہیں کسی قطعے میں جنگل کے ماحول کو پیدا کیا گیا ہے تو کیا کہنے۔ جنگل کے اُن درختوں پر رنگ رنگ کے خوش الحان پرندے اور اُن کے جھنڈ چہکتے اور اُڑانیں بھرتے پھرتے ہیں کہ اُن کے ہونے سے زمین پر جنت کا گمان ہوتا ہے۔ اِن درختوں کی خوبی یہ ہے کہ بہت قدیمی مگر جوان ہیں، ایک دُوسرے سے شانہ بہ شانہ یوں ملے کھڑے ہیں کہ جیسے عاشق اور معشوق گلے ملے ہوئے ہوں، اور جدائی کا کوئی تصور نہ ہو۔ ایسے قدیم وجدید درخت لارنس کے اِن خطوں میں ایستادہ ہیں کہ سُورج کی کرن، بعض مرتبہ مشکل سے زمین تک آپاتی ہے۔ اِس وجہ سے یہاں روشن دن میں سُہانی شام کا منظر ہمہ وقت ہوتا ہے۔ اِن مستی بھرے درختوں کے سُرمئی سائے میں خودرُو پودے ہیں، جڑی بُوٹیاں ہیں، اور اُن میں کھلے موسم کے اعتبار سے رنگ برنگے پھول ہوتے ہیں کہ جو اپنی بہار خود دیتے ہیں۔ گویا مستی کا ایک حسین سماں ہے کہ دل بچ بچ باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ پھر اور دیکھئے کہ اِس قدرتی حسن وجمال کے پیکر جنگل میں چھوٹی چھوٹی ندیاں کھالے بہتے ہیں، اور بل کھاتے چلے جاتے ہیں۔ رنگ برنگ کے پرندے اِن ندی نالوں کے کنارے اُگی گھاس میں پُھدکتے پھرتے ہیں، ایک دُوسرے سے مستی کرتے تھکتے نہیں ہیں، جب تھک جاتے ہیں تو ندی کا پانی پی کر پھر تازہ دم ہو جاتے ہیں، اور اُڑ کر کسی درخت کے سبز پتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور اپنی نرالی میٹھی آواز میں کوئی گیت، اپنی زبان میں گانے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو اُن کی خوش الحانی اور آواز کی موسیقی کا تھوڑا سا بھی شعور ہے تو آپ وہیں کسی جنگلی درخت کی جڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائیں گے، اور ماورائی موسیقی کے

قدرتی سُروں سے لُطف اندوز ہونے لگیں گے، اور اگر شعور نہیں ہے تو آگے بڑھ جائیں گے، کچھ سمجھ نہ پائیں گے ــــ !

یہی وجہ ہے کہ عاشقوں اور معشوقوں کے لئے جنگل کا یہ قطعہ، گوشۂ جنت کے مترادف ہے۔ چونکہ وہ خود عالمِ محویت اور خود فراموشی کے وجد میں ہوتے ہیں، اس لئے وہ نہ صرف اپنی معشوقہ کے حسن سے یہاں فیض یاب ہونا چاہتے ہیں بلکہ ایک آوارہ منش پرندے کی طرح عشق کے گیت بھی گاتے ہیں؛ جو غالباً آنکھوں میں فقط نرم و نازک چوڑیوں بھری کلائی اور انگوٹھیوں بھرے نازک ہاتھ پکڑ کر ہی ممکن ہے۔ جس کی آواز فقط ایک دُوسرے کو ہی سُنائی دیتی ہے، دُور تک نہیں جاتی ــــ !

ہم نے یہاں اِس حسین خودرُو جنگل کی مست سدا بہار ہریالی میں ایسے ایسے حسین اور مدہوش پرندوں کے جوڑے بھی دیکھے ہیں جن کی سرمستی اور ایک دوسرے پر عاشقی فقید المثال ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ جتنا گہرا اور گھنا گوشۂ جنگل، اُسی قدر سرمستی، پرندوں کے رنگ بھی متوالے اور لباس بھی نرالے ــــ ایک پرندہ مولسری کے قدیمی درخت کی جڑ سے ٹیک لگائے، نیم وا مدہوش آنکھوں سے سامنے والے اشوکا کے بھاری تنے سے ٹیک لگائے اپنی حسین مادہ کو ٹکٹکی لگائے، پلکیں جھپکائے بغیر گھنٹوں دیکھتا ہے اور تھکتا نہیں ہے۔ مولسری کا درخت، وقفے وقفے سے اپنے خوشبودار سفید پھول، اُن پر نچھاور کرتا جا رہا ہے۔ اور اشوکا کا درخت، جب اپنے پتے ہوا کے زور سے تالیاں بجانے کے انداز میں پھڑ پھڑاتا ہے تو مولسری کے درخت سے پھولوں کی برسات تیز ہو جاتی ہے: اور معشوقہ کی بھاری پلکیں حسن اور محبت کے خمار سے آلودہ ہو کر نیم وا اور مست ہو جاتی ہیں، اور آنکھوں کی اُبلتی مستی کو جب مولسری کے پھولوں کا خمار اور نشہ بہم پہنچتا ہے تو فضاؤں اور دِلوں میں جلترنگ سا بجنے

لگتا ہے۔ اِس جلترنگ موسیقی میں کلائی کی چوڑیوں کے چھنکنے سے جو راگ دیپک شامل ہوتا ہے تو مستی اور محبت کے گیت جنگل کی خمار آلود فضا کو اور طرب انگیز بنا دیتے ہیں۔ ایسے میں مولسری کے تنے سے ٹیک لگائے عاشق کی عاشقی اور محبوبہ کی دلربائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اپنی ٹانگیں پسار کر خوابوں کی دُلہن کی طرف پھیلا دیتا ہے، اور خوابوں کی دُلہن اُس کے پیروں سے دھیرے دھیرے کھیلنے لگتی ہے اور کبھی شرارت سے تلوے سہلاتے سہلاتے، اپنے حنائی ہاتھوں سے گدگدانے لگتی ہے ـــــ تو دونوں کے بدن جلترنگ بجانے لگتے ہیں۔ ایسے میں پانی کی کُل کُل اور ہوا کی تھرتھراہٹ عجیب سماں پیدا کرتی ہے، جس سے انگ انگ میں جوانی بہار دکھانے لگتی ہے۔

عین اسی وقت، دُور پھولوں کی کیاریوں والے قطعہ گھاس میں بھی ایک بینچ پر ایک حسین نوجوان جوڑا، ایک دُوسرے سے لگا بلکہ جڑا بیٹھا ہوتا ہے۔ یہاں بھی پیار کے گیت سُروں میں ڈھالے جا رہے ہوتے ہیں، چاروں جانب رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں، اور ایسے ہی رنگ رنگ کے پھول دلوں میں کھل رہے ہوتے ہیں۔ دونوں بہت قریب قریب ہوتے ہیں کہ سانسوں کی ہلکی سی گرمی بھی آگ بن کر بدن کو جلانے جھلسانے لگتی ہے۔ دلوں کی دھک دھک ایک دُوسرے کو صاف سُنائی دینے لگتی ہے۔ تب وہ مہ جبیں اپنی حنائی اُنگلیوں سے خود بخود کھیلنے لگتی ہے۔ اُس کی مخروطی اُنگلیوں کے رقص کو دیکھ کر عاشق کا دل دیوانہ ہوا جاتا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنا کھردرا ہاتھ اُس کے ریشمی ہاتھ کی طرف بڑھاتا ہے اور اَب خود اُس کی مخروطی اُنگلیوں سے کھیلنے لگتا ہے۔ دونوں ایک پیار بھری نگاہ سے ایک دُوسرے کو دیکھتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ ابھی فرطِ محبت سے لپٹ ہی جائیں گے، مگر باغ کی عریانی اور لوگوں کی آمد و رفت کے سبب ٹھہرے جاتے ہیں، اور بس بوسے کی آرزو میں ہونٹ پھر پھڑا

کر رُک جاتے ہیں، صرف اُن کے ہونٹ فرطِ محبت سے فقط کانپ رہے ہوتے ہیں۔ ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں پسینہ آ جاتا ہے، اور آنکھوں میں شرارے لپکنے لگتے ہیں۔ محبت کی گرمی پہلے تپش بنتی ہے اور پھر انگارہ بن جاتی ہے۔ گلشن میں چلتی ٹھنڈی ہوا بدن کو جھلسانے لگتی ہے اور لڑکی گھبرا کر اپنی قمیض کے دو بٹن بے اختیار کھول دیتی ہے۔ وہاں پر پسینے کے قطرے گلابی بدن کی گولائیوں پر تیر رہے ہوتے ہیں، اور ٹھنڈی ہوا، اُن شبنمی قطروں کو سکھانے میں ناکام رہتی ہے۔ مخروطی محرابیں اپنی تمام تر گولائیوں اور نشیب و فراز کے ساتھ دل کی دھڑکن کے سبب جوار بھاٹے کے عالم میں مضطرب ہوتی ہے۔ ایسے میں عاشق کی نظریں بے قراری سے تڑپ تڑپ کر طوافِ مجسمۂ حسن کر رہی ہوتی ہیں، کبھی اِس گولائی سے پھسلتی ہیں اور اُس مخروط پر جا کر قرار پاتی ہیں اور کبھی اِس نشیب سے اُٹھتی ہیں اور اُس فراز پر جا کر سکون پاتی ہیں، اور وہ اپنے تسخیر کے بے لگام جذبے کو بڑی مشکل سے روکتا اور سمجھاتا ہے اور شاخِ بے نیام کو بڑی دقت کے ساتھ آسودگی سے روکتا ہے؛ کہ اتنے میں چند لڑکوں کی ٹولی اُن کے پاس سے قہقہے لگاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اُن کے قہقہوں کی سرمستی سے ماحول کا سارا سحر ٹوٹ جاتا ہے، اور پھر وہی ٹھنڈی ٹھنڈی بادِ صبا چلنے لگتی ہے۔

گلشن ریسٹوران کے خوبصورت اور آراستہ لان میں ایک میاں بیوی بیٹھے ہیں۔ لڑکی کے آگے میز پر پانی پوری کی بھری ہوئی پلیٹ رکھی ہے۔ وہ اُبکائیاں لیتی جاتی ہے اور گول گپے کھائے جاتی ہے اور ٹکٹکی باندھ کر محبت سے اپنے میاں کو والہانہ نظروں سے دیکھے چلی جاتی ہے۔ یہ نئے نئے دُولہا دُلہن ہیں۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ یہ نوجوان اپنی منکوحہ دُلہن کو پھوپھی کے گھر سے لاتے ہوئے اپنی ماں کی نظروں سے بھگا کر چند منٹ کے لئے گوشۂ عافیت میں لایا ہے تاکہ اُس کے دل کے سُسرالی

ہول کو کچھ لمحوں کے لئے سکون دے سکے ۔۔۔ اِن کی باتوں کا محور بیک وقت دو طرح کا ہے۔ کبھی محبت کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی خاندانی رشتے داریوں کی سیاست پر سیر حاصل تبصرے کرتے ہیں۔ لڑکی ساس اور نندوں سے بہت تنگ لگتی ہے اور دُولہا کو اس قسم کی واہیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ تو جلدی کا واویلا کئے ہوئے ہے کہ جلدی چلو امّاں انتظار کر رہی ہوگی، ابھی گھر جا کر ہانڈی روٹی بھی کرنی ہے۔ لڑکی جل کر گول گپّے کھاتے ہوئے کہتی ہے، مجھ سے پہلے کھانا کون بناتا تھا؟ جواب میں میاں کہتا ہے کہ مجھے تمہاری فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے: اور ہاں گھر جا کر کھانا ضرور کھا لینا ورنہ امّاں کو پتہ چل جائے گا کہ تم نے باہر سے کچھ کھایا ہے۔ لڑکی پوچھتی ہے وہ کیسے، تم بتاؤ گے تو پتہ چلے گا نا۔ وہ ناگواری سے منہ بنا کر اُدھر کر لیتا ہے جدھر افغانی بچے کسی کے جوتے پالش کر رہے ہوتے ہیں۔ اَب بولتے کیوں نہیں میاں مٹھو ۔۔۔ اور شوق و ذوق سے آخری گول گپّا کھا کر بڑی سی اُبکائی لیتی ہے ۔۔۔ !

اُدھر لارنس کے ایک لق و دق گھاس کے وسیع قطعے میں دو نوجوان لڑکیاں اور ایک امّاں بیٹھی ہیں۔ امّاں تو شکل سے کرخت اور زمانہ شناس لگتی ہے اور لڑکیاں، اسکول اور کالج کے یونیفارم میں ہیں، اور اُن کے پہلو میں ایک ایک کتاب اور ڈائری سی دھری ہے، دونوں لڑکیوں نے زبردست میک اَپ کر رکھا ہے۔ بھلا اسکول اور کالج کی لڑکیاں اِس طرح کا جل، مسکارے اور لپ اسٹک کی دبیز تہہ والا میک اَپ کرتی ہیں؟ یہ سوال حیرت انگیز ہے۔ ہم نے سوچا ہو سکتا ہے کہ آج کل ایسا ہوتا ہو، اور ان دونوں بچیوں نے دل کی لگن میں باغ میں جانے کا مطالبہ کیا ہو، اور امّاں اُنہیں دل بہلانے کو یہاں ذرا دیر کے لئے لے آئی ہو، مگر کچھ ہی دیر میں پتہ چلا کہ یہ بات "ہو سکتا ہے" تک ہی محدود نکلی؛ جب دو نوجوان ٹہلتے ٹہلتے اُن کے قریب گئے

اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ نوجوانوں نے بھی جوابی قہقہہ لگایا، وہ اُن سے دو قدم آگے گئے اور پلٹ کر واپس اُن کے پاس آئے اور بے تکلفی سے لڑکیوں کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ لڑکوں نے کوئی مستی بھری بات کی تو لڑکیاں اپنی اپنی چھوٹی شمیض کو خواہ مخواہ ٹھیک کر کے ہنسنے لگیں۔ ایک کی چھوٹی شمیض سیاہ رنگ کی تھی، اور دُوسری کی سُرخ۔ دونوں چھوٹی شمیضیں باریک سفید جارجٹ کی قمیض سے آرپار ایسے جھانک رہی تھیں، جیسے دانت منہ کھول کر ہنسنے پر سب کو نظر آتے ہیں۔ غالباً امّاں کو اِس سے زیادہ مستی پسند نہ آئی، یا پھر مستی کی مزید لست ختم ہوگئی تھی۔ اَب وہ چپ سادھ گئیں جیسے بدن میں لہُو نہ ہو، اور امّاں نے گفتگو کا باقی حصّہ خود سنبھال لیا۔ کام کی بات شروع ہوئی، جس کا مختصر آخری خلاصہ یہ نکلا کہ دونوں نے پانچ پانچ سو کا سبز گھاس جیسے رنگ کا نوٹ بڑی رازداری اور احتیاط کے ساتھ امّاں کو پیش کیا، جس نے جھپٹ کر اُن کو اپنے گریبان میں اُڑس لیا؛ گویا بات خوش اسلوبی سے طے پا گئی۔ ایک نوجوان نے کالی چھوٹی شمیض والی لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور ریسٹوران کے کیبن کی طرف چل دیا۔ دُوسرے نے لال چھوٹی شمیض والی کا سہارا لیا اور دُوسرے کیبن کو سدھارا ـــــ چند منٹ بعد دیکھا کہ وہ نوجوان باہر گیٹ کی طرف جا رہے تھے اور وہ چھوکریاں اپنی اپنی چھوٹی شمیضیں ٹھیک کرتی ہوئیں واپس امّاں کے چرنوں میں پالتو بلّی کی طرح آکر پھر سے نئے مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئی تھیں۔ بس اتنا پتہ چلا کہ سب ملے ہوئے ہیں، کیا ریسٹوران والا اور کیا چوکیدار، سب ایک تھالی کے چٹّے بٹّے ہیں۔

جس جگہ اَب قائدِ اعظم لائبریری ہے، اُس جگہ کبھی جمخانہ کلب ہوا کرتا تھا، جس کے مرکزی دروازے پر کچھ اِس طرح کی عبارت کا بورڈ آویزاں تھا کہ "ـــــ کتوں اور دیسی لوگوں" "کا" داخلہ ممنوع ہے۔ اَب موجودہ عہد میں فرق یہ پڑا

ہے کہ مندرجہ ذیل عبارتوں کے بورڈ جگہ جگہ آویزاں ہیں — پھولوں اور کیاریوں سے دُور رہیں — فحش حرکات کرنا منع ہے — کھمبوں سے دُور رہیں — اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو خود جا کر دیکھ لیں، آپ کو سچ مچ یقین آ جائے گا۔ اصل میں یہ ترقی کے نقارے ہیں جو جگہ جگہ سند بن کر آویزاں ہیں۔

کبھی اِس باغ میں عورتوں کے لئے ایک "پردہ باغ" ہوا کرتا تھا؛ جو اَب بچوں اور عورتوں کا جھولے والا باغ کہلاتا ہے۔ مگر مردوں کا داخلہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ ممنوع نہیں ہے۔ یہاں کی داستانیں بھی خاصی دل نشیں ہیں، کسی صاحب کا عشق اپنے محلّے کی پڑوسن سے چل پڑے تو یہ باغ کا حصّہ "ملاقاتِ پردہ نشیں" اِس طرح بن جاتا ہے کہ دونوں شام کو اپنے اپنے نونہال لے کر یہاں آ جاتے ہیں۔ بچے جھولے جھولنے میں مست ہو جاتے ہیں، اور باقی وہ دونوں کارِ عشق و مستی انجام دے کر دل کی حسرتیں اور پیاس بجھاتے ہیں، اور خوشی خوشی، مسرت کے ہنڈولے روشن کئے رات کو لارنس کی مشہورِ زمانہ فروٹ چاٹ کھا کے پاک پاکیزہ اپنے اپنے گھر آ جاتے ہیں۔ کاروبارِ عشق بھی اِس باغ کی بدولت چلتا ہے اور بچوں کی دل جوئی بھی ہو جاتی ہے۔

ایک قدیم روایت یہاں بدستور قائم ہے۔ وہ یہ ہے کہ صبح کی سیر — اِردگرد کی آبادیوں کے شرفا، خواتین و حضرات سردی ہو یا گرمی، صبح کی سیر کرنے پابندی سے آتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی اِن میں ہیں جو تیس چالیس سال سے روز صبح آنے کے عادی ہیں۔ نئے اور پُرانے سیر کرنے والے فرق کو جوتیوں کے فرق سے بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ نووارد اور فصلی عام جوتا یا چپل پہن کر آتا ہے تو مستقل ہوا خوری والا کینوس یا جوگر پہن کر آتا ہے۔ صبح کی سیر میں کوئی رش نہیں ہوتا، ورزش کے

شوقین پسینہ نکالنے میں مصروف ہوتے ہیں، اور تیز تیز سیر کرنے والے اپنی ذات میں مگن بھاگے چلے جارہے ہوتے ہیں — ہاں البتہ سال بھر میں ایک ایسا دن بھی آتا ہے کہ اُس روز یکا یک سیر کرنے والوں کا ہجوم بے پناہ ہو جاتا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ وہ ہے آخری چہار شنبہ، اُس دن آدھا شہر صحت کے حصول کے لئے اِس باغ کا رُخ کرتا ہے۔ اُس روز آنے والی خواتین نے زبردست میک اَپ کیا ہوتا ہے تا کہ دیکھنے والے کو بہار کا احساس ہوتا رہے، اور بیماری دُور دُور تک نظر نہ آئے۔ مرد بے زار اور پیر گھسٹ گھسٹ کر عورتوں بالیوں کی حفاظت کا فرض پورا کرتے نظر آتے ہیں، سگریٹ نوشی، کھانا پینا اُن فصلی بٹیروں کے ہمراہ ہوتا ہے۔

اگلے دن باغ میں پھر وہی بہار ہوتی ہے۔ یعنی بھنورے اور رنگ برنگے پھول، تتلیاں اور آدھ کھلی کلیاں، خوشبو سے مہکتی ہوئی، حسن سے نکھری ہوئی — ایسا لگتا ہے کہ باغِ جناح کا حسن سدا بہار ہے جو کبھی ماند نہ پڑے گا، ہمیشہ حسن وعشق سے آباد رہے گا — !

ڈاکو

ہو سکتا ہے کہ آپ ڈاکو کو نفرت، حقارت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں؛ مگر ایک گہرے اور طویل المدت غور و فکر کے بعد اِس سلسلے میں اَب میرے نظریات تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے میں بھی آپ کی طرح ڈاکو حضرات کو نہایت نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، مگر جُوں جُوں اِس شعبے کی گہرائی تک اُترا ہوں، مجھے محسوس ہوا ہے کہ اَب، آج کے زمانے میں بات بدل سی گئی ہے۔ اَب یہ شعبہ اتنا دقیق اور عمیق ہو گیا ہے کہ اِس پر باقاعدہ ہمدردی سے غور کی ضرورت ہے —— ارے نہیں آپ سراسر غلط سمجھ رہے ہیں، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اِس کو سائنسی

شعبہ قرار دیا جائے مگر یقین جانیے کہ اَب یہ سائنس ہی بن گیا ہے، مگر سینہ گزٹ قسم کی سائنس، عطائی قسم کی سائنس، بلا تحقیق کے سائنس، گویا عروج پر ہے۔ میں نے بہت تحقیق کی کہ یہ نام کسی نے، کسی برادری نے اپنی ذات کے لاحقے کے ساتھ رواج دیا ہو مگر حقیقت ہوتے ہوئے بھی ایسا نہیں ہوا ــــ ہاں البتہ ایک فرق نہیں مٹا، وہیں کا وہیں ہے، وہ یہ ہے کہ زمانے کے جس دور میں بھی کسی کو حتیٰ کہ ڈاکو کو ڈاکو کہہ کر مخاطب کیا تو اُس نے شدید بُرا منایا، احتجاج کرنے لگا، مرنے مارنے پر اُتر آیا، اپنے کو اِس سابقے اور لاحقے سے قطعی الگ قرار دیا؛ حالانکہ وہ یہی پیشہ اپنائے ہوئے تھا۔ سبحان اللہ آج بھی یہی صورت حال ہے جو بدستور قائم ہے۔

پہلے زمانے میں دو چار قسم کے ڈاکو ہوا کرتے تھے۔ چونکہ صدیوں سے اُن کی یہی دو چار قسمیں تھیں، اِس لئے اُن اقسامِ ڈاکو کا ذکر کرنا، بغرضِ مطالعہ از حد مفید اور معلوماتی ہے۔ اور اُن کا ذکر شریف نہ کرنا، ذکر سے گریز کرنا، علمی طور پر انتہائی نامناسب ہے؛ سو اِسی ہمہ گیر مفاد میں ہے کہ نئی نسل کو بتایا جائے کہ یہی ملّی و قومی مفاد میں ہے۔ اِس لئے اُن کا ذکر اہم ترین ادبی سرمایہ بن کر ظاہر ہوا ہے، اور یہ بھی کہ اگر اُن کا ذکر نہ کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ مرحومین بُرا منا جائیں، جس سے معاشرتی انتشار جنم لے لے۔

ابھی چند برس گزرے (تقریباً ۳۰ سال پہلے تک) سب سے زیادہ خوفناک اور دہشت کی علامت وہ ڈاکو ہوا کرتا تھا جو سات گراری کے چاقو سے مسلح ہوتا تھا۔ اُس کا یہ چاقو وزیر آباد (پاکستان) یا مراد آباد (انڈیا) کا بنا ہوتا تھا۔ ڈاکے کے وقت ڈاکو عموماً اکیلا ہوتا تھا، یا اُس کے ساتھ جو ساتھی بطور اسسٹنٹ ہوتا، اور زیرِ تربیت ہوتا تھا، اُسے حلقۂ واردات سے باہر کھڑا کیا جاتا تھا۔ یعنی اُس کو واردات میں شامل ہونے کی قطعی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اُستاد ڈاکو اُس سے لوٹے سامان کی

گٹھری اُٹھواتا تھا۔ بوقتِ ڈاکہ تیاری اِس واردات کی کچھ یوں ہوتی تھی کہ ڈاکو عموماً اکیلا ہوتا تھا، جسم پر ایک واحد لنگوٹ کس لیتا، پیر میں چپل بھی نہ ہوتا اور پورے جسم پر خالص سرسوں کا تیل چپڑ کر کاروبار پر رات کے اندھیرے گھُپ میں دیوار کے سائے تلے نکلتا؛ اَب ایسا نہیں ہوتا، اَب ڈاکو سورج جب نصف النہار پر ہوتا ہے، جب نکلتا ہے؛ خیر وہ قدیم معصوم سا ڈاکو اُسی سات گراری کے چاقو سے چھت یا دیوار میں سُوراخ بناتا اور کمرے میں اُتر کر، گھر والوں کی آنکھ بچا کر سامان سمیٹتا اور قریبی قبرستان میں جا کر کسی بوسیدہ قبر میں بیٹھ کر سامان کی چھانٹی کرتا۔ غیر ضروری سامان وہیں پھینکتا اور اصل قابلِ قدر اشیاء سمیٹ کر مختصر سی گٹھڑی کندھے پر دھر کر قبرستان کے کنویں پر جاتا، پانی نکالتا، مٹی اپنے جسم پر مل کر تیل اُتارتا، وہیں چھپائے ہوئے اپنے کپڑے پہنتا اور سیدھا اپنی محبوبہ کے گھر جاتا۔ محبوبہ عموماً ناچنے گانے والی معشوقِ دلنواز، بازارِ حسن کی دلرُبا ہوتی۔ وہاں دو تین دن قیام وطعام کرتا اور پھر اپنے کام پر نکل کھڑا ہوتا۔

اُن ڈاکوؤں کی محبوبائیں بھی عجیب ہوتی تھیں۔ کوئی ڈاکو کی گھنی لمبی مونچھوں پر دل ہارتی، کوئی اُس کے قد کاٹھ پر دل دے بیٹھتی، کوئی اُس کی لال لال آنکھوں پر مَرمٹتی، اور کوئی اُس کے چہرے پر لگے چاقو کے پرانے نشان سے محبت کرتی ـــــ جو سامان حضرت ڈاکو صاحب لاتے، سنا ہے کہ اُس میں قطعی کیڑے نہ نکالتی، چُوم چاٹ کر رکھ لیتی، زیور نہ بھی ہوتا تو بُرا نہ مناتی تھی، دل کی قدردان ہوتی تھی، محبت کی پاسداری پر جان دینے کو تیار رہتی تھی۔ محبوب کے آجانے کو کبھی تحفے پر ترجیح نہ دیتی تھی۔

ایک بوڑھے اور ریٹائرڈ ڈاکو نے مجھے بتایا کہ جب سے ایسی محبوبائیں ناپید

ہوئی ہیں، ہم نے ڈاکہ زنی چھوڑ دی ہے۔ اُس ڈاکو کے پاس اپنی باوفا محبوبہ کی ایک پرانی، رنگ اُڑی بلیک اینڈ وائٹ بوسیدہ سی تصویر بھی تھی، جسے ڈاکو صاحب نے سینے سے لگا کر حرزِ جاں کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ (آج کا ڈاکو اپنی محبوباؤں کی رنگین تصاویر چوری کے موبائل میں رکھتا ہے، موبائل کے ساتھ محبوبہ بھی بدل جاتی ہے) ہم نے پوچھا پھر محبوبہ کا کیا ہوا — آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے، بولے — پتہ نہیں کس حرامی نے مخبری کردی، پولیس دیواریں پھاند کر اندر آگئی۔ اُس نیک بخت نے کھڑکی کھول دی اور کہا، جیرے بھاگ جا — مگر پولیس اندر آچکی تھی؛ وہ میرے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی، سیدھی گولیاں اُس کے سینے میں لگیں؛ اُس نے میرے نام کی چیخ ماری اور دُنیا سے گزر گئی۔ میں کھڑکی پھاند چکا تھا، اُس کے خون کے چھینٹے میری قمیض پر فوارہ بن کر گرے، وہ قمیض میں نے آج تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے — بس اُس دن سے آج تک، نہ ڈاکہ ڈالا، نہ کسی کی پھوٹی کوڑی پر نظرِ بد کی ہے۔ اُس کی یاد میں آنسو بہاتا ہوں، اور ایک مزار کے برآمدے میں پڑا ہوں۔

دُوسری اور اہم قسم کے ڈاکو رسّہ گیر کہلاتے ہیں۔ رسّہ گیر ڈاکوؤں میں دو اقسام کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ ہم پہلے رسّہ گیر ڈاکو پر بات کرتے ہیں، وہ اصل میں بھینسوں کے ڈکیت ہوتے ہیں، جو باڑے سے بھینسوں کا پورا پورا ریوڑ اُڑا لے جاتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ کسی کو بھی قتل کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بطور اسلحہ پیتل کی دو طرفہ شاموں والے ڈنڈے ہوتے تھے، گتکا کھیلنے کے ماہر ہوتے تھے، اگر دس بیس آدمی اُن کے ڈاکے کے وقت راستہ روک لیتے تو ایسا گتکے کا ڈنڈا چلاتے کہ بیس کیا پچاس آدمیوں کا بھُرکس نکل جاتا۔ اِس فن کے سبب کوئی اُن کے پاس نہ لگتا تھا، یوں وہ پوری فنکاری کے ساتھ سو سو بھینس گائے

اُڑا لاتے تھے، اُن کا پیچھا کرنے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی تھی، کوئی اُن کا بال بھی بیکا نہ کر سکتا تھا۔ (اِس لئے کہ اُس دور کے دیہاتی، آج کے دیہاتیوں جیسے پتے باز نہ ہوتے تھے) اُن ڈاکوؤں کے ایک یا دو آدمیوں کے پاس پتھرا ہوتا تھا، جس سے وہ بندہ نہیں مارتے تھے بلکہ بھینسوں کے رسّے کاٹتے تھے۔ اگر کوئی بھینسوں کا رکھوالا شور مچانے کی کوشش کرتا تو اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر کسی درخت یا چار پائی کے ساتھ مُشکیں کس دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ آج کے ڈاکوؤں اور چوروں کی طرح گلا کاٹنے یا گولی مارنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

رسّہ گیر ڈاکوؤں کی دُوسری قسم بذریعہ گوہ ڈاکہ ڈالنے کی ماہر ہوتی تھی۔ یعنی وہ اپنے ساتھ ایک بڑا رسّہ اور گوہ جانور باندھ کر پرنے میں رکھتے تھے، کسی حویلی یا اُونچے مکان میں ڈاکے کا ارادہ ہوتا تو گوہ کی کمر میں ایک خاص گرہ کے ساتھ رسّہ باندھتے اور گھما کر گوہ کو مکان کی چھت یا کھلی کھڑکی میں نشانے پر پھینکتے، اُن کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ جب گوہ مقررہ مقام پر پہنچ جاتی تو دو تین مناسب جھٹکے رسّے کو دیتے، جھٹکا لگتے ہی گوہ اپنی فطرت کے سبب اپنے پاؤں ایسے جما دیتی کہ کوئی ہلا نہ سکتا، نہ چھڑا سکتا تھا۔ رسّہ کھینچ کر دیکھتے اگر رسّہ جم جاتا تو ڈاکو صاحب رسّے سے چھت یا کھڑکی سے کمرے میں پہنچ جاتے اور خاموشی سے گھر کا صفایا کرتے۔ جن ڈاکوؤں نے سائنس کے سہارے ترقی کر لی تھی، وہ کلوروفارم میں بھیگا رُومال ساتھ رکھتے تھے، جو گھر والا نظر آیا اُسے رُومال سنگھا کر بے ہوش کر دیتے تھے۔ جان کو نقصان یوں نہیں پہنچاتے تھے کہ ایک تو گھر لوٹیں اُوپر سے مار بھی دیں، یہ ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ یہ زندہ رہے گا تو کمائے گا اور دُوبارہ ڈاکے کی اُمید پیدا ہوگی، مر گیا تو بیوی بچے بددُعائیں دیں گے، بددُعا لگ گئی تو یہ لُوٹا مال کس کام کا ہوگا ـــــ مگر آج کا

لٹیرا سب سے پہلے قتل کرتا ہے، نہ بددعا کا ڈر ہے، نہ عذاب کا ڈر ہے۔ سرکار جو اپنی ہے ـــــ خیر ڈاکو کا دوسرا ساتھی باہر نیچے کھڑا رہتا تھا، سامان کا گٹھڑ بنا کر کندھے پر رکھا اور آسانی سے نیچے اُتر آئے، اور پھر بڑے طریقے سے گوہ کو بھی ڈھیلا کر کے نیچے کھینچ لیتے تھے۔ اگر گوہ واپس آنے پر رضامند نہ ہوتی تو اُسے وہیں چھوڑ آتے کہ اِس کی قسمت میں صبح گھر والوں کے ہاتھوں موت لکھی گئی ہے۔ بس ڈاکہ مکمل ہو گیا۔ نئی گوہ قبرستان سے دوبارہ ڈھونڈ لیتے تھے تاکہ نئے ڈاکے کی تیاری مکمل ہو سکے۔

چوتھے ٹھگ قسم کے لٹیرے ڈاکو ہوتے تھے، جو اپنی ذہانت اور چالاکی سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر سرِ عام لوٹتے تھے۔ اُن کا طریقہ واردات کچھ اِس طرح ہوتا تھا کہ آدمی سنے تو اُن کی عیاریوں، مکاریوں اور منفی ذہانتوں کا قائل ہو جائے۔ مجرمانہ نفسیات پر اُن کو آج کے ڈاکوؤں کی طرح زبردست عبور تھا، وہ مجرمانہ نفسیات کے عظیم الشان ماہر تھے، مگر تھے پچھے اَن پڑھ۔ انسانی قتل کرنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتے تھے، نشہ اور زہر پلا کر مار دینا معمولی بات تھی، آج بھی اِس خاندان کے ڈاکو، مزاروں اور میلوں میں عام ملتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ آج کا نوسرباز ڈاکو، اُن کو اپنا مائی باپ مانتا ہے، آج کے ہر طرح کے ڈاکو بھی انسانی نفسیات سے خوب آگاہ ہیں، یعنی کیسے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تو مالک کھولتا ہے اور کیسے دروازہ بجاؤ تو نہیں کھولتا۔ یہ اُن کا اعلیٰ وصف ہے، وہ مجرمانہ نفسیات کا زبردست استعمال کرنے کے ماہر ہیں۔ بہرحال اِس پر آگے چل کر بات ہوگی۔ ٹھگ، لٹیروں اور نوسربازوں کا ایک مشہور قصّہ بیان کرتا ہوں، جو آپ کو ششدر کر دینے کے لئے کافی ہے۔

قصّہ یوں ہے کہ ایک شخص نے ایک بہت خوبصورت اور صحت مند بکری منڈی سے مہنگے داموں خریدی۔ ٹھگ ڈاکوؤں اور نوسربازوں کا ایک گروہ خریداری کا

یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص بکری لے کر چلا اور ذرا دُور گیا تو ایک شخص پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ نے کتنا خوبصورت جانور خریدا ہے، واہ مزا آ گیا۔ یہ بتائیں کہ یہ کون سی نسل کا کتّا ہے، جو اتنا شاندار ہے۔ بکری کے مالک نے کہا جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ کتّا نہیں، بکری ہے۔ جواباً وہ شخص کہنے لگا ــــ چلو آپ کہتے ہو تو مان لیتے ہیں کہ بکری ہے، مگر کتّا ہے شاندار، دیکھنے کا مزا آ گیا۔ یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص اپنی راہ ہولیا۔ بکری والا ابھی چند میل ہی دُور گیا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی جو درخت کے نیچے بیٹھا تھا، اُسے دیکھ کر آگے بڑھ کر آیا اور بولا۔ یہ کتّا کتنے کا بیچو گے؟ مجھے تمہارا یہ کتّا بہت اچھا لگا ہے۔ بکری کے مالک کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا۔ اے عقل اور آنکھوں کے اندھے، بڈھے، تمہیں بکری کتّا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اجنبی جواباً مسکرایا، اور بُرا منائے بغیر بولا کہ تمہاری عقل پر پردہ پڑ گیا ہے، تم کتّے کو بکری بنا کر لوگوں کو دھوکہ دیتے پھر رہے ہو۔ ٹھگ اور نوسر باز تم جیسے ہوتے ہیں جو آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہیں۔ تم نے میری بات کا بُرا منایا ہے، مگر میں کتّے کو بکری کیسے تسلیم کرلوں، مگر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ کتّے کو نہیں بیچتے تو نہ بیچو مگر بکری تو نہ کہو ــــ یہ کہہ کر وہ دُوسری سڑک پر ہو لیا۔ بکری کا مالک پریشانی کے عالم میں اپنے گھر کی طرف چلتا رہا اور مُڑ مُڑ کر بکری کو دیکھتا رہا اور سوچنے لگا کہ اتنے مختلف طرح کے لوگ سرِ راہ ملے؛ سب نے کہا یہ کتّا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ میرے ساتھ منڈی میں دھوکہ ہو گیا ہے۔ منڈی کے آڑھتی بڑے مکّار تھے، بکری کی شکل میں مجھے کتّا بیچ گئے۔ ضرور اُنہوں نے جادُو کے زور سے میری نظر بندی کر دی ہے کہ مجھے کتّا، بکری نظر آ رہا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ اپنی بستی کے قریب پہنچ گیا کہ سامنے سے ایک باپ بیٹا اجنبی ملے، بچہ ابھی بہت کم سن اور نا سمجھ پانچ یا چھ برس کا لگتا تھا، بچے نے قریب آ کر

ضد کرنا شروع کر دی کہ میں تو یہی کُتا لوں گا۔ بچے کا باپ اُسے سمجھا رہا تھا کہ ایسا مریل سا کُتا تم لے کر کیا کرو گے۔ بچہ روئے جاتا تھا کہ میں لُوں گا تو یہی کُتا لوں گا۔ اِدھر بکری کا مالک سوچ رہا تھا کہ بچہ تو کم سن، نا سمجھ اور معصوم سا ہے: اُسے یہ بکری کُتا ہی نظر آ رہی ہے، تب ہی تو وہ اُسے کُتا کہہ رہا ہے۔ یقیناً میرے ساتھ زبردست دھوکہ ہوا ہے۔ میری بیوی کو کُتوں سے شدید نفرت ہے، اِس کُتے کو گھر لے کر گیا تو بیوی کھڑے کھڑے کُتے کو گھر سے نکال دے گی اور مجھے خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا کہ بکری لینے گیا تھا اور کُتا لے آیا۔ یہ سوچ کر اُسے خیال آیا کہ اِس منحوس کُتے سے یہیں نجات حاصل کرتا ہوں۔ بکری کے مالک نے ضدی بچے کو چمکارا، چپ کرایا اور بکری کی رسّی بچے کے ہاتھ میں تھما دی۔ بچہ خوشی خوشی بکری کو لے کر نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو تھوڑی دیر میں بکری کے مالک کا بیٹا گھر آیا اور پوچھا کہ ابا بکری کہاں ہے۔ ابا نے کہا کہ بکری تو میں نہیں لایا۔ بیٹے نے حیرت سے کہا کہ میں کھیت کی منڈیر سے دیکھ رہا تھا کہ آپ بڑی خوبصورت بکری پکڑے لا رہے ہیں۔ باپ نے کہا کیا واقعی وہ بکری تھی؟ بیٹے نے کہا۔ جی ہاں اور تمام نشانیاں بکری کی فر فر بتا دیں۔ تب باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اور بولا ٹھگوں ڈاکوؤں نے اپنی نوسر بازی سے مجھے پاگل بنا کر لُوٹ لیا ــــ یہ کہانی تو اپنے انجام کو پہنچی، مگر آپ سوچیں کہ آپ کی زندگی میں کیسے کیسے لوگ ہیں جو آپ کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر آپ کو دیوانہ اور پاگل بناتے ہیں، اور آپ بن جاتے ہیں۔ جو لوگ یہ طریقہ کار استعمال کرتے ہیں، وہ مجرمانہ نفسیات کے ماہرین ہوتے ہیں۔ اُن کی یک فقرہ مثال پیش کروں تا کہ آپ کی آنکھیں بھی کھُل جائیں۔ اُن کا سب سے کارگر حملہ اور جملہ یہ ہوتا ہے ــــ "آپ کہتے ہو تو مان لیتے ہیں ــــ" ــــ !

سب سے پہلی بات یہ تجربے میں آئی ہے کہ جن لوگوں کو کبھی ٹھگ ڈاکو کہا جاتا تھا، آج وہ عرفِ عام میں ترقی کر کے فراڈیے ڈکیت سیانے کہلاتے ہیں۔ اُن کو کسی کا مال ہتھیانے کا ہر حربہ، داؤ، پیچ آتا ہے۔ یہ بھی کہ پہلے کی طرح آج بھی وہ اور اُن کے گھر والے، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب مل کر فراڈ میں ملوث ہوتے ہیں۔ ہر واردات (نعوذ باللہ) اللہ، رسولؐ، قرآن، مذہب سے شروع کرتے ہیں اور اختتام اپنے کارِ واردات پر کرتے ہیں۔ گھر کے اتحاد کے بغیر اُن کی واردات مکمل نہیں ہوتی، گھر والوں کو اُس واردات میں شامل کر کے اُس میں دم پیدا کرتے ہیں۔ سب ایک دُوسرے کی نا صرف حفاظت کرتے ہیں بلکہ مل کر کاروبار کو ترقی دیتے ہیں۔ جب واردات مکمل کر لیتے ہیں تو اُس رات گھر میں سب کتّوں کی طرح مال پر لڑتے ہیں۔ ہمارے ایک جہاندیدہ دوست کا کہنا ہے کہ وہ اِن لوگوں کا گزیدہ ہے کہ اِس قسم کے گھرانے میں اتحاد بھیڑیوں کی طرح ہوتا ہے، اور عالم یہ ہوتا ہے کہ جو بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، وہ بھی اپنا پورا پورا کردار ادا کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتا ہے۔ کبھی آزما کر تو دیکھیں، آپ کو لُٹنے کا لُطف آ جائے گا۔ یہ خاندان بڑے کاریگر لوگ ہوتے ہیں، اور یہ ڈاکوؤں کی ایک معززانہ شکل میں نیک نام ہوتے ہیں۔ آج کے زمانے میں ہر جگہ وافر پائے جاتے ہیں۔ اِن کا گزر اوقات اِسی پر ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی "ٹھگی فطرت" پر مبنی پاگل بنانے والے جملوں کی۔ جو اِس قسم کی فطرت اور کردار والے لوگ معاشرے میں عام استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اِس فطرت کا آدمی ہو اور آپ اُسے شام چھ بجے بلائیں تو وہ سات بجے آئے گا۔ آپ شکایت کریں گے تو وہ بڑی دیدہ دلیری سے کہے گا ــــ آپ کی گھڑی ہی غلط ہے،

ویسے، آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں کہ سات بجے ہیں، وقت تو چھ کا ہے۔ آپ جواباً کہیں گے کہ آپ ایک گھنٹہ لیٹ ہیں، وہ جوتوں سمیت آپ کی آنکھوں میں گھس جائے گا اور کہے گا: پانچ ہزار کی شرط لگاتے ہیں کہ آپ کی گھڑی غلط ہے۔ آپ کہتے ہیں، میں شرط نہیں لگاتا۔ وہ کہے گا کہ اَب تو شرط لگ چکی ہے۔ آپ اُس کے دلائے جوش میں آجائیں گے اور شرط پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جب وقت ملایا جائے گا تو گھر کی گھڑی میں دو چار منٹ کا فرق نکل ہی آئے گا۔ بس وہ فراڈیا جیت گیا، فرق تو نکل آیا۔ اَب ساری اصل کہانی ختم۔ کہے گا کہ میں نے کہا تھا نا کہ آپ کی گھڑی میں فرق ہے۔ فرق چاہے ایک منٹ کا ہو یا ایک سیکنڈ کا، فرق تو فرق ہوتا ہے: لائیں دیں پانچ ہزار، آپ شرط ہار چکے ہیں۔ آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے، آپ سوچیں گے کہ اُس نے آپ کو کہاں گھیرا، کیسے گھیرا، اور کہاں لا کھڑا کیا، اور کیسے قابو کر لیا۔ اپنی شاطرانہ چال میں پہلے کس طرح پھنسایا، پھر بات کو کہاں سے کہاں لے آیا اور کہاں لا کر دے مارا — یہ اعلیٰ پائے اور اپنی قسم کا معزز فراڈیا آدمی ہے، جو کسی حال میں ہارنا نہیں جانتا، آپ کو ہر حال میں ہرانا جانتا ہے۔ اِس عمل کو وہ مختلف طریقوں سے دن میں ہزار بار انجام دیتا ہے، اور کئی شکار کرتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ جھوٹے، وعدے سے پھر جانے والے، زبان کے کچے، دھوکے باز اور کم ظرف اُسی کے ہاتھوں مشہور ہو جائیں گے، اور وہ سب سے زیادہ نیک، ایماندار اور پارسا خود اپنے آپ کو میاں مٹھو کی طرح کہتا نہ تھکے گا۔

دُوسرے مرحلے میں یہی شخص آپ کے دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کو روز بتاتا پھرے گا کہ آپ اُس سے پانچ ہزار کی مقروض ہیں۔ یہ اُس کا فائنل حربہ ہوگا، اور آخرکار آپ اُس کو نوازنے کے بارے میں سوچنے لگیں گے۔ یہی آپ کی ہار

اور معزز ٹھگ کی جیت ہے۔

آج کے زمانے میں ڈاکو کا کردار ایک نہیں ہزار رُوپ میں ہے، اور طریقۂ واردات اپنا اپنا ہے۔ ہر ڈاکو اپنے طریقۂ واردات میں یکتائے روزگار اور کسب کمال کا ماہر ہے۔ ایک شریف آدمی اُس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اُن کے کمالِ کسب کو گنوانے لگو تو ہزاروں صفحات درکار ہیں، جس میں مندرجہ ذیل عام طور پر دستیاب افکار یہ ہیں۔

جھوٹ بول کر گھٹیا مال فروخت کرنا؛ کم تولنا؛ رشوت لینا؛ پستول کے زور سے سرِ راہ مال چھیننا؛ درجہ اوّل کی بجائے درجہ چہارم کا مال اوّل کہہ کر فروخت کرنا؛ قانون کی تلوار سائل کی گردن پر رکھ کر مال و دولت وصول کرنا؛ نفسیاتی دباؤ میں لا کر مال وصول کرنا؛ ڈرا دھمکا کر مال نکلوانا؛ جھوٹے مقدموں میں پھانس کر مال پر قبضہ کرنا؛ کرایہ پر مکان لے کر جائیداد پر قبضہ کر لینا؛ کرایہ کا فرنش مکان لے کر اپنی امارت ظاہر کرنا اور امارت ظاہر کر کے شادیاں کرنا اور مال لے کر فرار ہو جانا؛ فراڈیئے کو انجینئر بنا کر اچھے گھرانے میں شادی کرنا؛ چھوٹے گھرانے کی لڑکی لا کر اپنے گھر نوکرانی بنا لینا؛ رشوت لینے کے لئے قانون کا پھندا گلے میں ڈال کر گھسیٹنا؛ چوری کا مال قسمیں کھا کر فروخت کرنا؛ اپنی زبان سے پھر کر مال وصول کرنا؛ دُوسرے کو جھوٹا اور خود کو سچا ثابت کر کے مال قابو کرنا، وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ آپ کو اجازت ہے کہ اپنے ذاتی تجربے کے مطابق اِس مختصر سی فہرست میں جو چاہے شامل کر لیں، کچھ نہیں کہا جائے گا ـــــ !

وہ زمانے گئے جب پستول کی مدد سے لُوٹ مار کی جاتی تھی، اَب پستول اور ڈکیتی سے زیادہ چالاکی کے پستول سے مال اُڑایا جاتا ہے۔ اِس میں یہ فائدہ ہے کہ آپ نیک رہتے ہو اور کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لفظوں اور باتوں سے بندے کو مارا جاتا

ہے۔ جادو گنڈہ، کالا علم معاون امداد کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، مگر اِن بدبختوں کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے، مگر ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ اِس لئے کہ اِن کی رسّی ذرا دراز ہے۔ مگر افسوس کہ جب اللہ کی مار پڑتی ہے تو یہ لوگ پھر بھی نہیں مانتے، اِس لئے نہیں مانتے کہ اِن کا دین، ایمان اور خدا، مال حرام اور اپنی بدکاری کا پیسہ ہوتا ہے۔ اُن کا ضمیر چونکہ مَر چکا ہوتا ہے اور اللہ اور رسولؐ سے ایمان اُٹھ چکا ہوتا ہے تو ایسے میں وہ مہلک بیماریوں، جوان موتوں اور دیگر آفاتِ الٰہی کو دُنیاداری قرار دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہوتا ہے کہ جب دُنیا میں رہنا ہے تو بیماری، موت، پریشانی تو آتی جاتی چیزیں ہوتی ہیں، اُن سے روزِ قیامت و قبر کی بات کرو تو کہتے ہیں کہ جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا، ابھی تو دُنیا سنوارو۔ یہ دُنیا کا ہر کام مکمل بے ضمیری کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جب ضمیر مَر جاتا ہے تو یہ کام آسانی سے ہونے لگتے ہیں، اگر ضمیر زندہ ہو تو راتوں کو نیند نہ آئے، مگر نشہ آور، خواب آور دوا کھانے کے باوجود ایسے لوگوں کا ضمیر سونے نہیں دیتا۔ اِس کے باوجود وہ روز صبح اُٹھ کر یہی کام کرتے ہیں۔

عام خوبی اِن میں یہ پائی جاتی ہے کہ آنکھ نہیں ملاتے، ایسے آنکھیں چُراتے ہیں کہ جیسے بھولے ہوں، کچھ معلوم ہی نہ ہو، معصوم ایسے کہ معصومیت اُن پر دم توڑتی ہے۔ کچھ پتہ نہ ہونے کا ڈھونگ ایسا رچاتے ہیں کہ الامان۔ جرم کر کے اللہ میاں کے فرشتے بن جاتے ہیں۔ پوچھو اور باور کراؤ تو کہتے ہیں ـــــ کیا ہوا ـــــ ؟

ضمیر کی موت، کردار کی موت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اُن قدیمی ڈاکوؤں کی قدر کرتا ہوں جو انسانی خون کی قدر کرتے تھے، جن کے ضمیر کسی حد تک زندہ تھے، ڈاکا اُن کا پیشہ تھا، وہ کسی انسان کو ہلاک نہ کرتے تھے۔ آج کا ڈاکو ایک دو ٹکے کے موبائل فون کے لئے دو روپے کی گولی سے قابل ترین ڈاکٹر، انجینئر کو سرِ بازار

قتل کر دیتا ہے اور قومی ضمیر اس قدر مُردہ اور بے حس ہو چکا ہے کہ وہ وہاں سے قتل کر کے زندہ چلا جاتا ہے، کوئی پکڑتا نہیں ہے۔ ہر کوئی کہتا ہے کہ اُسے اپنی جان پیاری ہے، دُوسرا مرتا ہے تو مر جائے ___ اگر سب مل کر اُس قاتل، لُٹیرے کو گھیر ڈال لیں تو وہ کیسے بچ کر جا سکتا ہے ___ سمجھو کہ ڈاکو لُٹیرے جاگ رہے ہیں، قوم سو رہی ہے، اُسے میٹھی نیند سے نہ جگاؤ۔

اُب تو یہی نظر آتا ہے کہ سب یونہی قتل ہو جائیں گے۔ ڈاکو راج ہو گا، ضمیر اور گھر کی تربیت جب مالِ حرام پر ہو تو معاشرہ ایسے ہی تشکیل پاتا ہے۔ جب باپ نے بیٹے کو پیدا ہوتے ہی مالِ حرام کھلایا ہو تو پچیس برس کی عمر میں وہ باپ سے بڑا لُٹیرا ہو گا۔ یاد رکھیے کہ رشوت، ڈکیتی، فراڈ اور ٹھگی وہی لوگ کرتے ہیں جن کا پورا پورا خاندان اِس میں براہِ راست ملوّث ہوتا ہے، ورنہ یہ کام کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ جب ماں کے دُودھ میں حرام ہو گا تو نسل سے کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ اگر خاندان ملوّث نہ ہو تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی مائی کا لال، مالِ حرام گھر لائے اور گھر والے یہ نہ پوچھیں کہ یہ تیری اوقات سے زیادہ ہے ___ بتا، کہاں سے آیا ہے یہ حرام ___ ؟؟؟

ایسا لگتا ہے کہ ہم ڈاکو معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔ اُن کی عزت نہ کی تو یہ جان سے ہی مار دیں گے؛ ہم سب کو ___ !

جھوٹ

جھوٹ سب سے بڑا سچ ہوتا ہے، اور سچ ہی سب سے بڑا جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ کسی فلسفی کا فرمان نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانے میں میرا قول ہے۔ اور یہ بھی میرا کہنا ہے کہ اتنا سچ نہ بولو کہ جھوٹ کا گمان ہونے لگے۔ ہاں البتہ اتنا جھوٹ بولو کہ سچ محسوس ہونے لگے۔ جیسے اتنا گڑ نہ ڈالو کہ کڑوا ہو جائے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنے والے کو اتنا ''ہٹ دھرم'' ہونا چاہئے کہ جیسا کہ ایسے جھوٹے تاریخ میں گزرے ہیں اور مرحوم ہیں۔ اِن جھوٹوں اور کاذبوں نے ایسا رنگ پکڑا ہے کہ اُن کا کہا جھوٹ، آج کا سچ بن گیا ہے۔ ہاں بس اُس جھوٹ کو سچ میں تبدیل ہونے میں کچھ صدیاں ضرور

خرچ ہوئی ہیں۔ مگر اسی جھوٹ کو عالمی سطح پر سب سے بڑے سچ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہم ایسے ہی سچ کی بات کر رہے ہیں کہ آپ اور ہم بھی، جھوٹے سچوں میں، کچھ عرصے بعد تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ اِسی کا نام سچ ہے، اور یہ آج کا سچ ہے، اور اِس سچ کے ماخذ کا نام جھوٹ ہے۔ یہ فلسفیانہ باتیں ہیں جو ہوسکتا ہے کسی کی سمجھ میں آئیں اور کسی کی عقل میں نہ آسکیں۔

اِسی لئے جھوٹ بولنا ایک اعلیٰ قسم کی فنکاری کا کام ہے، اور یہ فنکار آج کی تاریخ کے ہیرو کہلاتے ہیں۔ مگر جو عاقل اور پڑھے لکھے ہیں، وہ اُن کی فنکاریوں سے بخوبی آشنا ہیں اور جو مطلق بے عقل اور کوڑھ مغز ہیں، وہ اُن کی اِن فنکاریوں کو سچ کا اکھاڑا سمجھتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ جس تاریخ کے صفحے پر اُن کو سچا لکھا گیا ہے، اُسی تاریخ کے سامنے والے اگلے صفحے پر اُن کا فریب اور جھوٹ بھی لکھا ہے ـــ پڑھنے والے پہلے صفحے کے سحر سے جان چھڑائیں تو اگلے صفحے پر دھیان دیں۔ بس یہی المیہ ہے۔ یہ تمثیل اُن جھوٹوں کے لئے ہے کہ جن کا تاریخ میں اِس اسکول کے بچے جیسا حشر ہونے والا ہے، اسکول کے اُس بچے کی طرح جو ماسٹر صاحب کو گزشتہ روز کی چھٹی کی یہ وجہ بتاتا ہے کہ کل نانا انتقال فرماگئے تھے۔ ماسٹر صاحب نے اظہارِ ہمدردی کے لئے پوچھا کہ بیٹا سوئم کب ہوگا تو فٹ سے بولا۔ اُن کے مرنے کے تیسرے دن ہوگا، ماسٹر جی ـــ بیٹا جھوٹ نہ بولو؛ صبح نانا جی تو تمہیں اسکول چھوڑنے آئے تھے، میں نے خود دیکھا تھا۔ بچہ بولا ـــ اوہ سر جی آپ نے نانا جی کی رُوح کو دیکھا ہوگا، چھوڑنے تو ابا جی آئے تھے ـــ ! ـــ اب تو ٹلتا نہیں جھوٹ بولنے سے ـــ آپ جو سچ بلوانے پر تُلے ہوئے ہیں، ماسٹر جی ـــ !

یقین مانیے سچ بولنے کی نسبت جھوٹ بولنا، آج کے ہی نہیں بلکہ ہر دور میں

بہت آسان کام ہے۔ اس کی خوبیاں سننے کا شوق ہو تو کسی پیشہ ور جھوٹے سے سنئے۔ طبیعت میں پُر بہار سرُ ور نہ آجائے تو کہئے گا ـــــ جس دن جھوٹا مست ہو گا تو عالم مستی میں کوّے کو سفید قرار دے گا۔ آپ تو تڑپ کر ہی رہ جائیں گے، پر جب وہ عالم مستی میں کہے گا کہ میں تو برفانی کوّے کی بات کر رہا ہوں تو آپ ششدر رہ جائیں گے کیونکہ برفانی کوا سفید ہی ہوتا ہے ـــــ !

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں جھوٹ بولنے پر کمر کس لوں تو کیا کیا ہو گا، بلکہ کیا کیا نہ ہو جائے گا۔ اور کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ اگر میں جھوٹ بولنے کو بطور پیشہ اپنا لوں تو کیسے کیسے انقلاب برپا ہوں گے۔ یہ سوچ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ بزرگوں سے سنا ہے کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت اور لوگوں کی پھٹکار ہوتی ہے۔ اس سب کے باوجود ایک روز میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نا ایک ہفتہ جھوٹ کے جھولوں کا مزا لیا جائے۔

صبح صبح جب ناشتے سے فارغ ہوا تو ایک دوست کا فون آیا ـــــ کہنے لگا، ابھی ملنے آنا چاہتا ہوں، اجازت ہو تو ابھی آجاؤں؛ میں نے تمہارے بارے میں ایک بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ میں نے کہا، کیا خواب ـــــ گھبرا کر کہنے لگا، آکر بتاؤں گا۔ ہم باریابی کی اجازت دینا ہی چاہتے تھے کہ یاد آیا کہ رات سونے سے پہلے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ صبح سے ایک ہفتے کے لئے سچ نہ بولیں گے۔ میں نے کہا بھائی، میں گھر پر نہیں ہوں ـــــ پوچھنے لگا کہ کہاں ہو ـــــ میں نے کہا بچے کا ڈومیسائل بنوانے کچہری آیا ہوا ہوں ـــــ خوشی سے چلّا کر بولا؛ یہ تو بہت اچھا ہوا، میں بھی کچہری کے مین دروازے پر ہی کھڑا ہوں، بولو تم کس جگہ ہو، میں آتا ہوں ـــــ ہم پکڑے جانے کے خوف سے ایک مرتبہ تو لرز گئے، مگر شیطان نے کان

میں ڈانٹ کر کہا ــــ ابے گھبراتا کیوں ہے، کہہ دے کہ میں تو رکشے میں بیٹھ چکا ہوں ــــ ہم نے کہہ دیا ــــ وہ بولا کمال کرتے ہو، میں رکشہ اسٹینڈ پر ہی کھڑا ہوں، میں نے تو تم کو نہیں دیکھا ــــ شیطان نے ہماری گھبراہٹ دیکھ کر پھر کان میں کہا، ابے کچھ بہانہ کر دے ــــ ہم نے کہا، کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو جو ملے نہیں ــــ وہ ٹلنے کو قطعی تیار نہیں تھا۔ بولا گھر جا رہے ہو کیا ــــ میں نے کہا نہیں، پہلے انارکلی جاؤں گا، پھر گھر کی باری آئے گی ــــ بولا، کوئی بات نہیں میں تمہارے گھر جا کر بھابی سے چائے بنواتا ہوں، اتنے میں تم گھر آ ہی جاؤ گے ــــ میں نے دل میں کہا، لعنت ہے تجھ پر، میری جان کیوں نہیں چھوڑتا ــــ یار پھر کسی دن پر ملاقات نہ رکھ لیں ــــ بولا، زیادہ بکواس نہ کرو، میں بس آ رہا ہوں ــــ یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ شیطان میرے سامنے کھڑا، دانت نکال کر شیطانی مسکراہٹ میں کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ میں بھی مسکرانے لگا ــــ سیدھا بیگم کے پاس گیا اور کہا کہ ابھی وہ دوست آئے گا، اُسے کہہ دینا کہ ہم باہر گئے ہیں، وہ چائے مانگے گا تو دے دینا، اور کہنا کہ ابھی وہ کافی دیر میں آئیں گے۔ بیگم نے فرمانبرداری سے ہاں کر دی ــــ پھر ایسا ہی ہوا۔ میں ایک گھنٹے بعد اُسے جا کر ملا تو کہنے لگا کہ رکشے کی آواز تو گلی سے آئی نہیں، تم کیسے آ گئے ہو ــــ میں نے کہا، گلی کی نکر سے پیدل آیا ہوں۔ اُس نے غور سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور بولا، بالوں سے تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے ابھی سو کر اُٹھے ہو، کیا چکر ہے بھائی ــــ میں جھنجھلا کر رہ گیا ــــ کام کی بات کر یار، بک بک نہ کر ــــ بولا، رات میں نے تمہارے بارے میں ایک بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کہ تمہارے سر پر ایک مکروہ صورت شخص ڈھول ڈھکیتے مارے جا رہا ہے اور تم زار و قطار رو رہے ہو، شکل اور حلیے سے وہ شخص شیطان سے بہت مشابہ

تھا ــــ میں نے پوچھا، تم نے شیطان کو کبھی دیکھا ہے؟ کہنے لگے، دیکھا تو کبھی نہیں مگر عقل سے تو پہچانا ہے، تم ذرا اپنے دشمنوں سے بچ کر رہنا۔ آج کل کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کون کیسا خبیث فطرت ہے ــــ یہ سُن کر میری تو سِٹی گم ہوگئی ــــ ابھی تو جھوٹ کے کارخانے میں قدم نہ رکھا تھا کہ معاشرے کو خبر ہوگئی اور پکڑے گئے ــــ اللہ خیر کرے۔ اُسی وقت توبہ کی اور شیطان اور جھوٹے پر لعنت کر کے سارا قصہ دوست کو بیان کر کے دل ہلکا کیا۔ سچ بات کا زبان سے کہنا تھا کہ رُوح کو سکون اور دل کو قرار آ گیا۔

ایک سیاسی تبصرہ نگار جو ہمارے دوست ہوا کرتے ہیں، ایک دن فرمانے لگے کہ تمھیں پتہ ہے کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔ میں نے عاجزی سے اقرار کیا کہ مجھے پتہ نہیں ہے ــــ کہنے لگے، سیاست وہ سچ ہوتا ہے کہ جس میں جھوٹ نہ ہو، مگر سچ بھی نہ ہو ــــ میں نے کہا، یہ کیا بکواس کر رہے ہو، سیاسی بیان کی طرح ــــ کہنے لگے، اُن میں رہ کر ہم نے یہی سیکھا ہے؛ جس میں تم بھی پھنس گئے ہو اور تم نے میری بات کی سچائی تسلیم کر لی ہے ــــ ہم نے حکمت کے بوجھ سے سر ہلایا اور خاموش ہو گیا، اِس لئے کہ یہی سچ تھا کہ سب ناممکن کی میٹھی گولی میں پوشیدہ تھا، میٹھا میٹھا مگر کڑوا ــــ ہم نے پوچھا جیالا کون ہوتا ہے ــــ کہنے لگے، وہ احمق جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ سمجھتا ہے، اور اپنی جان قربان کر دیتا ہے ــــ ہم نے کہا، یہ تو معاشرتی اور اخلاقی ظلم ہوا ــــ کہنے لگے، اپنی مرضی سے آیا تھا، اپنی مرضی سے بات کا مطلب سمجھا تھا، اور اپنی مرضی سے قربان ہوا؛ اِس میں ہمارا کیا قصور نکلا ــــ ؟ ہم چپ ــــ !

سمجھ یہ آیا کہ جھوٹ بولنے اور اُس پر قدرت پانے کے لئے بھی بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے؛ مگر اُن لوگوں کو نہیں جو پیدائشی جھوٹے ہوتے ہیں۔

پیدائشی جھوٹا ہونا بھی بڑے فن اور فنکاری کی بات ہے۔ میرے نزدیک جھوٹوں کی سب سے اعلیٰ قسم یہی ہے ــــ میری اِس بات سے دیگر جھوٹے اپنا دل چھوٹا نہ کریں، ہم اُن کی بھی بہت قدر کرتے ہیں ــــ مگر سچ یہی ہے کہ جو جوہر پیدائشی جھوٹوں میں پائے جاتے ہیں، وہ کسبی جھوٹوں میں خال خال ہی ملتے ہیں۔ پیدائشی جھوٹے کا مستقبل تابناک جھوٹ کا انمول نمونہ ہوتا ہے۔ اُس کا مقام اِس معاملے میں بہت بلند اور ناقابلِ تسخیر ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی گرد کو کسی عام قسم کے جھوٹے کا پہنچنا خاصہ مشکل اور رکاوٹوں کے پہاڑ جیسا ہوتا ہے۔ مگر ایسے ایسے منچلے جھوٹے بھی ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ اپنی محنت اور ہمت کے سبب اِس اعلیٰ مقام کو نہ صرف پا لیتے ہیں بلکہ سچوں کے لئے، اپنے جھوٹ کے سچے سہارے کے سبب مات بھی دے دیتے ہیں۔ بس یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں سچا، جھوٹا کہلاتا ہے اور جھوٹا سچا ــــ!

جھوٹوں کے سردار بھی دُنیا میں پائے جاتے ہیں، جن کے سبب جھوٹوں کی دُنیا قائم ہے۔ اِن سرداروں کی خصوصیات بڑی انمول، لاجواب اور بے مثل ہوتی ہیں۔ انہی خصوصیات کے سبب اِن کی سرداری قائم ہوتی ہے۔ چھوٹا موٹا جھوٹا، سردار کا مقابلہ کسی صورت میں نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ناقص سردار کے مقابلے پر اُترے تو ایسی مات ہوتی ہے کہ منہ کے بل گرتا ہے، اور کسی جھوٹے کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا ــــ جھوٹوں کے سردار کی زبان، جھوٹ سے بالکل کالی نہیں ہوتی، جبکہ عام سے جھوٹے کی زبان کالی ہوتی ہے۔ یہ مشہور بات ہے، اِس لئے یہاں کہہ دی ہے۔ سردار کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسا سفید جھوٹ بولنے کا ماہر ہوتا ہے کہ سچا اُس کے سامنے معافیوں، تلافیوں پر آ جاتا ہے، اور آئندہ سچ بولنے سے تائب ہو کر جھوٹوں کی سب سے نچلی جماعت میں داخلہ لینے کا اعلان کر دیتا ہے۔ اَب یہ اور بات ہے کہ

وہ اُس جماعت کو اٹینڈ کرے یا نہ کرے۔ نا اٹینڈ کرنے کی صورت میں اپنا نقصان خود کرتا ہے، اور جھوٹوں کے سردار کے سامنے اُس کی عزت دو ٹکے کی رہ جاتی ہے — اِس کے بعد وہ جتنا جی چاہے سچ بولے، جھوٹا ہی کہلاتا ہے۔ اگر جھوٹ کے اسکول کی دو جماعتیں پڑھ لیتا تو یوں عزت پامال نہ کراتا۔

جھوٹوں کا سردار عزت و آبرو میں اعلیٰ ترین مقام کا حامل کہلاتا ہے۔ اُسے کہیں بھی یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ جھوٹوں کا باکمال سردار ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ اُس کی اعلیٰ سچائی کا آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں — سردار کی ہر بات کمال کی سچ ہوتی ہے۔ اُس کی بات کو ہر فورم پر خاص اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، جبکہ سچے کی بات کو اُس کے مقابل جُوتی کی نوک پر رکھا جانے کا عام دستور اور رواج ہے۔ عام آدمی جس کا جھوٹ اور سچ سے کوئی روایتی یا خاص رشتہ نہیں ہوتا، وہ سب سے پہلے جھوٹوں کے سردار کی بات پر یقین کرتا ہے۔ اِس لئے کہ بات میں دم ہوتا ہے، دل پر چوٹ کی طرح اثر کرتی ہے۔ عام آدمی کو اِس لئے پسند ہوتی ہے کہ وہ اُس پائے کا جھوٹ بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ گویا جھوٹوں کا سردار اُن کے دل کے ارمان اپنی زبان سے پورے کر کے، اُن کے سپرد کر رہا ہوتا ہے۔ اِس پر خواہ مخواہ آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے، اور جس بات کو دل چاہنے لگے وہ دل سے ہوتی ہوئی سیدھی سکون کے بحرِ بے کراں میں جاتی ہے۔ تب جھوٹ کا خواہش مند بے دھڑک ہر لفظ پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا ہے۔ جس بات پر بہت سے آدمی یقین کر لیں، تو وہ سراسر سچی بات کہلانے کی حقدار ہو جاتی ہے۔ یہی جھوٹوں کے سردار کی کلین بولڈ جیت ہوتی ہے، اور سچ کی کہانی ڈالنے والوں کی موت ہوتی ہے۔

جھوٹ ایک علم و دانش کا بے پناہ خزانہ ہے۔ اِس کو اگر سمندر بھی کہو تو کم ہی گردانا جانے کا امکان ہے۔ جب اِس کا بیج دماغ اور رُوح میں پڑ جاتا ہے تو ایک خودرُو پودے کی طرح ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں ہر لمحے خود بخود اُگتا ہے۔ اگر کوئی سچا اس کی پیدائش کو خواہ مخواہ بند باندھ کر روکنے کی کوشش کرے تو رُوح میں بے چینی کن عذاب کا جوار بھاٹا بن کر سکون چھین لیتا ہے۔ پھر جب تک اُس کو نہ بولو، تب تک قرار نہیں آتا۔ چین کی نیند بھی نہیں آتی۔ گویا جھوٹے میں جھوٹ کا اِظہار، رُوح کا قرار بن کر پروان چڑھتا ہے۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ جھوٹے کی بات کا اعتبار کیوں کر لیتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ جھوٹا اتنی گنجائش ہی نہیں چھوڑتا کہ اُسے جھوٹا کہا جا سکے۔ اُس کے کہے کو جھٹلایا جا سکے۔ تو ایسی صورت میں اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ ایسا جھوٹ بولتا ہے کہ اُس پر سچ کا گمان ہوتا ہے، اور جس بات پر سچ کا گمان غالب ہو، اُس کو سندِ تصیقی کیسے مل سکتی ہے — !

بہت سے لوگ جھوٹوں اور جھوٹ کے ایسے عاشق ہوتے ہیں کہ اپنے مصاحب میں جھوٹوں کی ایک فوج ظفر موج جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اِس سے اُن کے قلب کو دو گونا سکون اور کاروبار کو مزید ترقی ملنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ یہ احساس ہی اُن کو معاشرے میں زندہ رکھے ہوتا ہے کہ اُن کی بات کے آگے کوئی مائی کا لال ٹھہر نہیں سکتا، اور مقابلہ کرنے کی قطعی ہمت نہیں رکھتا۔

ہمارا یہ بھی قولِ زرین ہے کہ ہر جھوٹا چاہتا ہے کہ اُس کے سامنے سچ اور صرف سچ ہی بولا جائے۔ پانسے کا سچ، سچے اور کھرے سونے جیسا سچ، ایسا سچ کہ اُس میں کوئی کسی قسم کا کھوٹ نہ ہو۔ پھر وہ اِسی سچ کو سُن کر جھوٹ کا مطالعہ تیار کرتا

ہے۔ یاد رکھیں جتنا بڑا جھوٹا ہوگا وہ اپنے سامنے اُتنا ہی سچ سننے کا آرزومند ہوگا۔ مگر خود کبھی سچ نہ بولے گا، دُوسروں کو سچ بولنے پر مجبور کرے گا — یہ ایک لعنتی فعل ہے جس کو ایک جھوٹے کے مرنے کے بعد اُس کی قبر پر لکھا ہوا پایا گیا — !

جھوٹ بولنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دُوسرا ہمیشہ اندھیرے میں رہتا ہے۔ حقیقت اُس سے کوسوں دُور رہتی ہے، یا وہ حقیقت سے بہت دُور بھٹکتا ہے۔ اِس عمل کے وقوع پذیر ہونے سے جھوٹے کو تحفظ اور برتری کا احساس ہوتا ہے، اور جھوٹ گزیدہ کو اپنے کمزور ہونے کا دھیان رہتا ہے۔ اِس کومبی نیشن سے ایسی فضا بنتی ہے کہ جس سے ہمیشہ جھوٹا ہی فائدہ اُٹھا کر آسودہ خاطر ہوتا ہے۔ جھوٹ گزیدہ ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے، روتا ہے اور اُسے کوئی تسلی دینے والا نہیں ہوتا۔ وہ جھوٹ سے ڈسے جانے کے بعد صرف تڑپ تڑپ کر ہاتھ ملتا ہے، اور سارے لوگ اُسے ہی جھوٹ گزیدہ ہونے پر لعنت ملامت کرتے ہیں۔ جبکہ جھوٹ کا شہزادہ اِس فتح کا جشن، گوشہ عافیت میں بیٹھ کر مناتا ہے، اور جھوٹ گزیدہ کے حال پر افسوس اور دُکھ کا اظہار کرتا ہے، اور یہ بیان جاری کرنے کے بعد جشنِ فتح کے نقارے بجائے جاتا ہے۔ یہ صرف اِس لئے ہوتا ہے کہ جھوٹے کے سامنے بات کے دونوں رُخ ہوتے ہیں، اور جھوٹ گزیدہ کے سامنے بات کا فقط ایک رُخ ہوتا ہے، جو اُس کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔

جھوٹ کی اعلیٰ اقسام میں ڈھٹائی کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جتنا بڑا جھوٹ، اُتنا بڑا جھوٹا، اور اُتنا ہی بڑا ڈھیٹ — جتنا ڈھیٹ ہوگا، اتنا ہی جھوٹ، اعتماد اور پورے یقین کے ساتھ بولے گا۔ جس قدر اعتماد ہوگا، اُسی قدر اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔

سب سے دلچسپ جھوٹ وہ ہوتا ہے جو شوہر بیوی سے اور بیوی شوہر سے بولتی ہے۔ لیکن تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ سب سے زیادہ جھوٹ شوہر ہی بیوی سے بولتے ہیں۔ بیویوں کا اِس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ چونکہ شوہر زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور پتہ نہیں کیسے اور کس حال میں گزارتا ہے؛ اِس لئے وہی سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جبکہ شوہروں کا خیال یہ ہے کہ وہ گھرداری اور تعلق داری میں سب سے زیادہ جھوٹ بولتی ہیں۔ پیسوں کی کمی کا جھوٹ بیوی بولتی ہے، اور جواباً مزید پیسوں کی کمی کا جھوٹ شوہر بولتا ہے۔ اِس معاملے میں دونوں کی منطق اور پوزیشن ایک جیسی ہوتی ہے۔ مگر قناعت پسند بیویاں اور کھرے شوہر اِس معاملے میں صرف سچ بولتے ہیں، جس کا سچائی کے ساتھ یقین بھی کرتے ہیں، اور کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی۔ شوہروں کا خیال ہے کہ وہ بیویاں جو شوہر کا پیسہ اپنے میکے کو بھرتی ہیں، اُجاڑو قسم کی ہوتی ہیں۔ پیسے کو اپنے پرائیویٹ اکاؤنٹ میں بھرنے کی ہوس میں مبتلا ہوتی ہیں، اور بعض اپنے چاہنے والوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں کہ شوہر صاحب کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ باہر سے کچھ پتہ چل جائے تو ٹھیک ورنہ شوہر کے دخولِ قبر تک پتہ نہیں چلتا کہ دیا تو کہاں دیا، آیا تو کہاں گیا — اِس سارے کھیل کی سجاوٹ کا سہرا صرف اور صرف جھوٹ کے سر ہوتا ہے۔ جو جتنا جھوٹ کا ماہر ہوگا، اتنا ہی کامیاب و کامران ہوگا۔ ناکام شخص ذلت کا منہ دیکھے گا اور رُسوائی سے ہمکنار ہوگا۔ بعض مرتبہ جھوٹ ایسی حالت میں عزت عطا کرنے کا باعث بنتا ہے، اس بات کا یقین کرنے کے لئے تجربہ کار ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے —!

عاشق معشوق لوگ بھی ایک دُوسرے سے کافی بلکہ بہت کافی جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ آج کل جھوٹ کے بغیر عشق کا پودا پروان نہیں چڑھتا۔ جس

میں سب سے بڑا جھوٹ یہ ہوتا ہے کہ دُنیا میں تم سے زیادہ حسین، دُوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس بات کو آپ آفاقی (یونیورسل) جھوٹ بلا کسی ثبوت کے کہہ سکتے ہیں۔ باقی جھوٹ دُوسرے نمبر پر ہوتے ہیں۔ مثلاً تم چاند جیسی یا جیسے ہو؛ میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا یا سکتی ہوں؛ جان کی قسم سب سے بڑی جھوٹی قسم ہوتی ہے، جس کے کھانے پر دونوں میں محبت بڑھتی ہے۔ اگر یہ قسم نہ کھائی جائے تو شکایت رہتی ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں کیونکہ تم نے تو کبھی میری جان کی قسم نہیں کھائی۔ تارے توڑ کر لانے والی بات آج کے محبوب اور محبوبہ کے نزدیک سب سے بڑا جھوٹ شمار ہوتی ہے۔ جس پر دونوں قطعی یقین نہیں کرتے، بس مکاری سے مسکرانے پر گزارہ کرتے ہیں کہ یہی سچ ہوتا ہے اور دونوں بخوبی جانتے ہیں۔

ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے میں دوکاندار کا ثانی نہیں ہوتا۔ اُس کے لہجے کا ٹھہراؤ اور اعتماد گاہک کو اپنے جھوٹ کے جال میں مکڑی کی طرح جکڑ لیتا ہے۔ بعد میں کیا ہوگا، یہ کس نے دیکھا ہے۔ مکڑی کا قاعدہ ہے کہ اپنے باریک، بظاہر کمزور مگر مضبوط سے جال میں شکار کو دھوکے سے جکڑ لیتی ہے تو فوراً سب سے پہلے شکار کا خون چوستی ہے۔ بعد میں ہڈیاں، بوٹیاں بھی کھا جاتی ہے، یہ منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب شکار کھا لیا جاتا ہے تو بعد میں کس نے دیکھا کہ کیا ہوا تھا، اور کیسے ہوا تھا۔ یہ اصلی جھوٹ کا کمال ہوتا ہے، جب مدعی نہ رہا تو دعویٰ کیسا ——!

یہ تو تھے جھوٹ کے پول —— اَب سچوں کی بات بھی کر لیتے ہیں۔ وکیلوں سے زیادہ سچا رُوئے زمین پر کوئی نہیں ہوتا۔ اُن کا سچ سولہ آنے کھرا ہوتا ہے۔ سچ کے سہارے ہی وہ اپنے داؤ پیچ اور قانون کے پھندے تیار کر کے اپنا مرید بچاتے ہیں۔ ایسے وکیل بھی ہوتے ہیں جو فقط جھوٹ کا پردہ چاک کر کے سچ کے سہارے اپنا کیس

جیت جاتے ہیں، اور جھوٹ کو مات ہوتی ہے۔ اِس لئے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، اور سچ کو آنچ نہیں ہوتی۔ جو کیس اللہ کی عدالت میں دائر کیے جاتے ہیں، اُس کے فیصلے دیر سے آئیں یا جلدی: تاریخی، ابدی اور ناقابلِ بحث ہوتے ہیں۔ سچ کا بول بالا دیکھنا ہو تو وہاں دیکھیے، عقل دنگ رہ جائے گی۔ جو وہاں جھوٹ اور جھوٹے کی ذلت ورُسوائی ہوتی ہے، اُس کا طوق روزِ قیامت تک گلے سے نہیں اُترتا۔ نہ دُنیا میں، نہ آخرت میں۔ جھوٹ اور جھوٹا، مردُود ٹھہرتا ہے، اور کبھی سُکھی نہیں رہ سکتا۔ اُس کا ضمیر خواہ سویا ہوا ہی کیوں نہ ہو، بہر حال جینے نہیں دیتا، خواہ وہ ظاہری طور پر کتنا ہی مطمئن کیوں نہ ہو۔ اُس کا یہ اطمینان جھوٹ کا انگارہ بن کر اُس کی زبان پر رکھا رہتا ہے، جس سے اُسے کبھی نجات نہیں ہوتی، مگر جھوٹ پہ جھوٹ بولے چلے جاتا ہے، کبھی عذاب سے نہیں ڈرتا۔ حالانکہ سچ کا خوف اور جھوٹ کا عذاب اُسے دُنیا میں ہی لحہ لحہ قتل کر رہا ہوتا ہے۔ مگر وہ جھوٹ کے فریب میں مست ہوتا ہے، اور یہ مستی اُسے تکنے نہیں دیتی ـــــ نہ یہاں پر، نہ وہاں پر ـــــ !

بازارِ حُسن

بازارِ حسن کا نام سنتے ہی سب کا دماغ اُدھر ہی کو جاتا ہے، جدھر یہ بازارِ حسن ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ میں کچھ اور ہی سوچتا ہوں۔ میری عقل میں بازارِ حسن کچھ اور ہی نوعیت کا ہے۔ جس میں وہ نہیں ہے کہ جو آپ کے خیال میں ہے، اور جو آپ کے خیال میں ہے وہ میرے خیال میں نہیں ہے۔

اِس مرحلے پر مجھے آپ کے خیال اور تصوّر سے زیادہ اپنے خیالات کو بیان کرنا ہے؛ سو اِس لئے انہی کو بیان کرتا ہوں۔ یہ دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی ''بازار'' اور ''حسن''۔ اگر ہم ذرا دیر کو اِن الفاظ کو اُلٹ دیں تو ''حسن بازار'' بطرز بانو بازار،

مینا بازار اور آرائش حسن بازار بنتا ہے۔ اَب بس میرا معصومانہ سوال معذرت، معافی اور عاجزی کے ساتھ یہ ہے کہ اگر بازار کے ساتھ حسن ہٹا کر کوئی اچھا سا، نازک سا اور حسین نوعیت کا لفظ لگا دیا جائے تو کیا بازار میں موجود دُوکانوں کا مال بدل جانے کا امکان ہے؟ مجھے آپ کے عاقلانہ جواب سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مگر مثال یہ دیتا ہوں کہ اگر بازار کے ساتھ انارکلی جوڑ دیا جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ انارکلی بازار میں اکبری منڈی کا سودا بکنے لگے ___ ؟ ہر گز نہیں بکے گا۔ بس وہی بکے گا جو انارکلی میں پہلے بکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہاں بھی عورتوں کی آرائشِ حسن کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں، مگر یہ بازارِ حسن نہیں کہلاتا تھا، اور نہ ہی حسن بازار کہلاتا ہے۔ یہی حال بازارِ حسن کا ہے، آپ فوراً فرمائیں گے، حضرت آپ سٹھیا گئے ہیں کیا ___ کہاں انارکلی بازار، کہاں حسن کا بازار؛ کیوں آپ انارکلی کی توہین کر رہے ہیں۔ وہاں کاروبار حسن و جمال ہوتا ہے، اور وہاں بھی کاروبار آرائش و جمال ہوتا ہے۔ میں نے گھبرا کر عرض کیا حضرت آپ تو مجھے سُوئی کے نکے سے گزار رہے ہیں۔ کہنے لگے عقل استعمال کریں، عقل کے گھوڑے دوڑائیں، سب جو پسِ آئینہ ہے، بُروئے آئینہ ہو جائے گا۔ اور آئینہ وہ شے ہے کہ جس کے بغیر حسن اور جمال اپنے کمال کو نہیں چھو سکتا۔ حسن اور آئینے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حسن آئینے کے بغیر نامکمل ہے، اور آئینہ حسن کے بغیر بے معنی اور لایعنی ہوتا ہے۔

مانا کہ عوام کی زبان میں بازارِ حسن، وہ بازار کہلاتا ہے کہ جہاں فقط عورتوں اور اُن کے حسن و جمال کی خرید و فروخت کا کام ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بیان بھی مہمل اور لایعنی ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ حسن بازار میں عورتوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا ہو، وہ ہماری زبان میں "بازارِ حسن" کہلاتا ہے۔ اے ظالموں کوئی ایسا نام رکھتے کہ جس سے اِس کاروبار کی نوعیت ظاہر ہوتی۔ پھر ایک دلیر منچلے نے لقمہ دیا

کہ حضرت یہ خفیہ اور اشارتی زبان کا لفظ ہے تاکہ کسی کی شرافت پر ضرب نہ آئے، نہ عورتوں کی شرافت پر، اور نہ مردوں کی شرافت پر ـــ پوچھا کون سا اشارتی لفظ ـــ تو بولے ـــ بازارِ حسن، اور کیا ـــ !

بہرحال ہم یہ کہتے ہیں کہ شہر میں کئی بازار ہیں، جن کے نام بازارِ حسن کی طرح مشکوک نوعیت کے تجویز کر کے زبان زدِ عام کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے سوچ کے دھارے اور کردار کی پاکیزگی کافی حد تک مشکوک ہو گئی ہے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بازارِ حسن سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہاں خوبصورت عورتوں کے حسن کا لین دین ہوتا ہے۔ عقل مندوں کا اس موقع پر یہ کہنا ہے کہ یہ اشاروں میں کی گئی بات ہے؛ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔ اتنے ہٹ دھرم کیوں ہو گئے ہیں کہ بازارِ حسن کو عورتوں کی خرید و فروخت کا بازار تسلیم نہیں کرتے ـــ ہم نے کہا کہ اس لئے نہیں کرتے کہ اس سے یہاں کی کاروباری نوعیت بالکل واضح نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ نام تو گمراہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ جو یہاں ہوتا ہے، وہ اس کے نام سے نظر نہیں آتا، اور جو نہیں ہوتا وہ بیان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ عورت کو نشانہ بنا کر ظلم اور اس کی کردار کشی کے زمرے میں نہیں آتا ـــ ؟

پھر ایک صاحب تلملا کر بولے ـــ چلئے پھر اس کو ڈائمنڈ مارکیٹ کہہ لیتے ہیں۔ ہمیں اس پر بھی شدید اعتراض ہوا۔ کہا کہ آپ کو پتہ ہے کہ ڈائمنڈ مارکیٹ کا مطلب کیا ہے؟ وہ معصومیت سے فرمانے لگے۔ ہیرا منڈی ـــ ! ـــ بہت ہی خوب ـــ ہم نے جل کر کہا۔ کیا یہاں ہیروں کی منڈی اور دوکانیں ہوتی ہیں۔ بڑی راز داری اور دبی دبی شیطانی مسکراہٹ زیرِ لب لا کر فرمانے لگے ـــ ارے آپ سمجھتے ہی نہیں ـــ ہیرا کہہ کر عورت مُراد لی ہے سیانوں نے ـــ ہم نے گھبرا کر کہا ـــ ہیرا تو ایک پتھر ہوتا ہے، اُس کا عورت جیسی نازک، خوبصورت اور حسین

ذات سے کیا تعلق — ؟ کہنے لگے آپ بہت کوڑھ مغز لگتے ہیں: بھائی چونکہ یہاں ہیرے جیسی انمول اور حسین عورتوں کا لین دین ہوتا ہے، اِس لئے حرفِ عام میں اور شرافت کی زبان میں اِس کو ہیروں کی منڈی کہا جاتا ہے — میں نے کہا، بھائی اَب تم ''ہیر'' کو ذلیل اور رُسوا کرنے پر آ گئے ہو۔ یہ بات ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ وہ ایک پاک باز اور نیک عورت تھی، بے شک حسین تھی، صرف سچے عشق سے نامور ہوئی اور کچھ حصّہ اُس کی ناموری کا حضرت وارث شاہ کے حصّے میں آتا ہے کہ اُنہوں نے اُس کا درونِ خانہ راز، اپنی شاعری چمکانے کے لئے استعمال کیا۔ خود تو نامور ہو گئے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہیر کی پرسنل لائف کو بڑی بدنامی دے گئے۔ ہم تو ہیر کے قدر دان ہیں، اُس کے عشق کی عظمت کے قائل ہیں، مگر اُس کی رُسوائی ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، بلکہ کسی بھی عورت ذات کی رُسوائی ہمیں پسند نہیں ہے، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو — یہ بات بالکل اِسی طرح ہے کہ ہم کسی حسینہ سے والہانہ اور افلاطونی عشق کریں اور کوئی شاعر اُٹھ کر ہماری داستانِ عشق و محبت کو اپنی شاعری چمکانے کے لئے بطور سیاسی ہتھیار استعمال کرے۔ ایسے نابکار شاعر کی دُرگت نہ بنا دی جائے، جو ہمارے پاک و پاکیزہ عشق کا اشتہار چھاپ کر اپنی ناموری کرتا ہو، اپنی دُوکان کی بِکری بڑھاتا ہو۔ بڑا ظلم ہوا ہے ہیر اور اُس کے عاشق کے ساتھ — رانجھے کو تو کوئی منہ ہی نہیں لگاتا۔

فرمانے لگے — جناب آپ بات کو قطعی طور پر غلط راستے پر لے گئے ہیں۔ کجا ہیر اور کجا ہیرا منڈی — بڑے دُکھ کی بات ہے یہ — ! — بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگے کہ عورت بھی تو ہیرا ہوتی ہے، اُس کی نسبت سے اِس کاروبار کی جگہ کو ہیرا منڈی مان لیا گیا ہے۔ میں نے کہا لعنت ہے تمہاری سوچ پر — ہیرا خواہ

عورت ہو یا پتھر، دولت ہوتا ہے اور دولت تو چھپا کر رکھنے کی چیز ہے۔ سر بازار رکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اور جہاں تک اِس بات کا تعلق ہے کہ شہر میں وہی فقط ہیرا منڈی یا ڈائمنڈ مارکیٹ ہے تو یہ بات میں نہیں مانتا۔ اس لئے کہ شہر میں اور کئی ڈائمنڈ مارکیٹیں ہیں۔ تڑپ کر پوچھنے لگے۔ کہاں، کس جگہ ___ ؟ میں نے عرض کیا بھائی جہاں ہیرے بکتے ہیں وہاں ___ قیمت اُن کی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بڑا نایاب اور خوبصورت پتھر ہوتا ہے یہ ___ ایسا پتھر جس کا دل اور جگر نہیں ہوتا۔ بس چمکتا، دمکتا اور لشکارے ایسے مارتا ہے کہ دل کھینچ لیتا ہے۔ دُکانیں اِس کی بہت خوبصورت اور رُومان پرور بنائی جاتی ہیں۔ کروڑوں کا مال ہوتا ہے اُس میں۔ ایسی ایسی ذات کے نایاب ہیرے ہوتے ہیں کہ ایک نظر دیکھ لو تو راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ اِن کو دیکھ کر مرد تو کیا عورت بھی تڑپ کر اُس پر دم دے دے اور سسکی بھی نہ لے۔

آنکھ دبا کر بولے کبھی آپ نے ڈائمنڈ سپر سٹور میں قدم رنجا فرمایا ہے۔ ہاں ایک مرتبہ وہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی قیمت بھی اتنی زیادہ تھی کہ دل دھک سے رہ گیا ___ اُس نے لقمہ دیا ___ چھوٹی چیز تو جناب مہنگی ہی ملتی ہے، آپ بڑی چیز اپنی جیب کے مطابق دیکھ لیتے۔ یہ کہہ کر وہ شیطانی مکروہ ہنسی ہنسا ___ میں نے کہا بھائی جب چھوٹی چیز کے خریدنے کا یارا نہیں تھا تو بڑی کا بھاؤ پوچھ کر کیوں شرمندہ ہوتے۔ اتنی شرمندگی کی تاب اور حوصلہ ہم میں قطعی نہیں تھا۔ ایک تین ہیروں کی انگوٹھی پچاس ہزار کی بولتا تھا ___ تو تم ایک ہیرے والی کا پوچھتے، تم بھی تو سیدھے تین ہیروں پر رِیجھ گئے ___ اِس عمر میں اکٹھے تین ہیرے کیسے سنبھالو گے۔ اُس نے فکرمندی سے کہا ___ میں نے جواباً جل کر کہا کہ میں انگوٹھی کے ہیروں کی بات کر رہا ہوں ___ وہ بولا میں تین حسیناؤں کی بات سمجھ رہا تھا ___ !

ہمارے ملک میں کبھی ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا ـــــ اُس نے حکم شاہی راتو رات جاری کیا کہ ملک کے تمام ''حسن کے اڈے'' صبح بند کر دیئے جائیں۔ صبح ہی حکم کی تعمیل ہوگئی اور تمام کے تمام بیوٹی پارلر بند کر دیئے گئے۔ شام ہوئی تو بادشاہ سلامت نے اپنے وزیروں اور مصاحبوں سے معلوم کیا کہ ہمارے حکم کا کیا ہوا جس میں ہم نے حسن کے اڈے بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ چیلوں کی عقل ہی چھوٹی تھی۔ ظاہر ہے جیسا بادشاہ ہوگا ویسے مصاحب رکھے گا۔ اُنہوں نے بتایا کہ جنابِ والا ملک میں تمام افزائشِ حسن کے اڈے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اُس نے پوچھا کہ کوئی ری ایکشن تو نہیں ہوا ملک میں۔ مصاحبوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ جناب ملک کی کثیر تعداد عورتوں نے سڑکوں، گلیوں اور گھروں میں مظاہرے شروع کر دیئے ہیں، اور اُن کے شوہر الگ سے مظاہروں کی تیاری کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہم اتنی بدصورت عورتوں کے ساتھ مزید زندگی نہیں گزار سکتے ـــــ بادشاہ بولا ـــــ ابے تم نے کیا کر دیا، میں نے حسن کے اڈے بند کرنے کو کہا تھا، بیوٹی پارلر بند کرنے کو نہیں کہا تھا۔ کم عقلو جاؤ، بھاگ کر جاؤ اور اُن کو فوراً کھلوا دو، اور بازارِ حسن کے اڈوں کو بند کرا دو۔ سب نے حیرت سے لمبی سی ہوں کی اور بگٹٹ بھاگے اور جا کر حسن کے اڈے کھلوائے اور حسن کے بازار بند کرا دیئے۔ تب بادشاہ کو سکون ہوا، اُس رات بادشاہ بڑے سکون کی نیند سویا ـــــ!

بادشاہ تو سکون کی نیند سو گیا مگر اِس کے ردِعمل میں جو واقعہ ہوا وہ کچھ اِس طرح سے تھا ـــــ ہوا یہ کہ بادشاہ کو کسی نے بتایا کہ آپ نے بہت دنوں سے کوئی ایسا حکم نہیں فرمایا، جس سے قوم میں کچھ کرنے کی اُمنگ جاگے، اور سوئی ہوئی قوم میں بیداری کا احساس پیدا ہو ـــــ منہ چڑھے وزیر کی بات بادشاہ کے دل کو تیر کی طرح لگی۔ بادشاہ نے غور و فکر کا لبادہ اوڑھ لیا اور دم سادھ کر ایک حجرے میں حیات بعد

ازممات کے گہرے فلسفے کے نروان کی تلاش میں کھو گیا۔ ابھی وہ اُونگھا ہی تھا کہ اُسے نئے آئیڈیا نے بیداری سے ہمکنار کر دیا ـــــ اُس نے نروان کا بوسیدہ لبادہ اُتار کر دُور پھینکا اور حکم نادر شاہی جاری کیا کہ شہر میں تمام بیت الخلاء جو کارپوریشن اور ضلعی انتظامیہ نے ایک جگہ، بغرضِ رفع حاجت و حاجاتِ ضرور یہ بنا رکھے ہیں، فوراً سیل کر کے بند کر دیئے جائیں۔ جو کوئی دن یا رات میں کھولے گا اور استعمال کرنے کی کوشش کرے گا، اُسے قرار واقعی سزا دی جائے گی، اور نشانِ عبرت بنا دیا جائے گا ـــــ وجہ اس حکمِ حاکم کی یہ بتائی گئی کہ اِن کی وجہ سے شہر میں گندگی کا احساس سرِ عام ہوتا ہے۔ چونکہ ایسی گندی جگہوں کی اس خوبصورت شہر میں قطعی گنجائش نہیں ہے؛ اس لئے اِن میں جانا، اِن کا استعمال کرنا اور اِن کا ہونا اِس پاکیزہ صفت شہر میں ایک اخلاقی اور سماجی داغ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے ان کو فوراً بند کر دیا جائے ـــــ ایسا ہی ہوا، ملک کے ہر شہر کے مرکزی بیت الخلاء بمطابق حکمِ شاہی فوراً بند کر کے سر بمہر کر دیئے گئے۔ پولیس کے ہرکارے اُس کی سمت جانے والوں کو پکڑ پکڑ کر بند کرنے لگے ـــــ نتیجہ اِس کا چند گھنٹوں میں یہ ہوا کہ اِس کاروبار کے لوگ بھاگ بھاگ کر شہر میں گلی گلی بکھر گئے۔ جس کو بھی رفع حاجت کی ضرورت ہوتی، وہ کہیں بھی فراغت حاصل کر لیتا۔ یوں گندگی جو کبھی ایک جگہ محفوظ طریقے سے ہوا کرتی تھی، پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہر گلی اور محلّے میں بیت الخلاء کا کاروبار کرنے والوں نے محلّہ در محلّہ گھر کرائے پر لے لئے اور اُن میں خاموشی سے بیت الخلاء کھول لئے، اتنی رازداری برتی کہ بادشاہ اور اُس کے مصاحبوں کو خبر ہی نہ ہو سکی، مگر جگہ جگہ بیت الخلاء کھل گئے۔ بیت الخلاء کے حواری اور گرگے شہر کی گلیوں اور چوکوں میں کھڑے ہو گئے۔ وہ وہاں تصویریں دکھا دکھا کر لوگوں کو بڑی رازداری سے آگاہ کرتے کہ اب یہ انتظام فلاں گھر میں کر دیا گیا

ہے، آپ وہاں گھر جیسے ماحول میں حاجت ضروریہ اور اخراج مادہ غلیظہ سے، پہلے سے بہتر طریقے سے کر کے فارغ ہو سکتے ہیں۔ نہ سرکار کا ڈر ہے نا کارندہ سرکاری کا خوف ہے۔ یہ کاروبار اِس طرح پہلے سے بھی زیادہ چمکا ــــ بس اتنا ہوا کہ گندگی مخصوص علاقے سے نکل کر شہر کے محلّے محلّے، گلی گلی پھیل گئی۔ چند دن بعد بادشاہ نے مصاحبوں سے پوچھا کہ اُس حکم کا کیا ہوا ــــ مصاحبوں نے اُن کے نام کی تسبیح پڑھتے ہوئے عرض کی۔ یا امیر المومنین؛ قوم نے آپ کے حکم کو سر آنکھوں پر لیا ہے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ قوم بھی یہی چاہتی ہے، سب صاف ہو گیا ــــ فرمایا، خوب بہت خوب ــــ ہمارے بعد کے آنے والے بادشاہوں کو بھی خبر کر دو کہ اَب آئندہ ایسا ہی ہوگا۔ (اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے پتہ تھا کہ میرے بعد کون کون بادشاہ ہوگا) خیر پھر سب نے اِس بات کی تائید کی اور جب سے اِس ملکِ پاکیزہ میں رفع حاجت کے بیت الخلاء محلّوں میں آباد چلے آتے ہیں ــــ یہ کہہ کر وہ بادشاہ گہری نیند سو گیا اور بازارِ حسن گلی در گلی آباد ہو گئے ہیں۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس کاروبار کو نچلی سطح پر خوب ترقی ملی ہے۔ مگر جب عمیق تحقیق کی تو محسوس ہوا کہ اِس کاروبار میں عورتیں بطور مجبور اور مظلوم شامل ہیں، صرف کوئی کوئی اِس کا شوق رکھتی ہے۔ اصل میں اِس کاروبار کے حقیقی وارث مرد ہیں ــــ وہ مثال یہاں قابلِ ذکر ہے کہ ایک درخت اپنے کٹنے پر رو رہا تھا، کسی نے جواباً کہا کہ یہ سب لوہے کی آری کا قصور ہے۔ درخت نے آنسو بہاتے ہوئے کہا نہیں ــــ اگر اُس میں لکڑی کا دستہ نہ ہوتا تو مجھے اور میرے مضبوط تنے کی لکڑی کو کوئی نہیں کاٹ سکتا تھا ــــ بس اِس سے زیادہ اِس باب میں کچھ کہتے ہوئے خوف آتا ہے کیونکہ اُن کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط اور ہمارے ہاتھ بہت چھوٹے اور کمزور ہیں۔

بھولا اور بھولی

بنیادی طور پر یہ ایک تمثیل کے دو نام ہیں۔ بھولا جنسِ کرخت اور بھولی جنسِ لطیف ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں پہلے سے ہو؛ مگر تفصیل سے بتانا اِس لئے ضروری ہے کہ جن کو خبر نہ ہو، وہ معاشرے میں یہ نا کہتے پھریں کہ ہمارے ساتھ تو بھولے اور بھولی کے حوالے سے زبردست دھوکہ ہو گیا ہے۔ یہاں ہماری طرف سے اِس قسم کی دھوکہ دہی اور غلط فہمی کے تدارک کے لئے باقاعدہ اور واضح قسم کی وضاحتیں جاری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہاں البتہ جنسِ وسط میں اِس علامت کے لئے چونکہ کوئی خاص لفظ مستعمل نہیں ہے، اِس لئے سب کو

آزادی دی جاتی ہے کہ اگر کوئی خود کو بھولا بتائے تو فوراً مان لیں، اِس میں آپ کی بھلائی ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی بھولی ہونے پر اصرار کرے تب بھی صنفِ نازک کا احترام کرتے ہوئے تسلیم کرلیں؛ کیونکہ اِس قسم کے تسلیمات سے بھولے اور بھولی کو کوئی فرق نہیں پڑتا، مگر آپ کو پڑسکتا ہے۔

بھولے اور بھولی کی جدید تفصیلات کا عمیق مطالعہ کرنے سے پہلے بہت ضروری ہے کہ قدیم بھولے اور بھولی کی تشریح، نہایت بالغانہ انداز میں کردی جائے تاکہ کسی اندرونی یا بیرونی غلط فہمی کا احتمال نہ رہے اور نہ کسی فساد کا اندیشہ ہو ـــ عہدِ قدیم اور عہدِ مزید قدیم بلکہ یوں کہیں کہ عہدِ قرونِ وسطیٰ میں فقط پچھلے چند برس کے گم گشتہ عہد تک بھولی اور بھولا اُن کو کہا جاتا تھا، جو عقل و دانش میں معصومانہ طرزِ عمل کا محاکمہ رکھتے تھے۔ پھر جن بچوں کو جدید سائنس کی روشنی میں ڈاؤن سنڈروم ہوتا تھا، وہ بھولے اور بھولی کہلاتے تھے۔ اور جن بچوں کو فقط پیار کی معصومانہ بات پر بھولا، بھولی کہا جاتا تھا؛ وہ ہوتے تو نارمل بچے تھے مگر اپنی فطری اور عمری حماقتوں کے متواتر اجتماع کے سبب بھولے بھالے، اور اگر لڑکی ہوتی تو بھولی کہلاتی تھی ـــ جو بچے اِن پیار کے ناموں کے علاوہ اپنی قدرتی فطرت کے سبب بھولے بھالے ہوتے، وہ تاحیات ہی اِسی نام سے پکارے جاتے۔ یہاں تک کہ وفات بھی بھولے یا بھولی کے نام سے پاتے تھے۔ وفات کے وقت نمازِ جنازہ میں مولانا پوچھتے کہ مرحوم یا مرحومہ کا اسمِ شریف کیا تھا تو بھولا یا بھولی بتایا جاتا۔ وہ گھبرا کر کہتے کہ اِس ہفتے ہم نے تین بھولوں اور دو بھولیوں کی نماز پڑھائی ہے؛ کیا سارے بھولے اور بھولیاں تیزی کے ساتھ دُنیا سے رُخصت ہو رہے ہیں ـــ ایسے میں وہ خود کلامی کرتے اور بڑبڑاتے ہوئے حیرت سے کہتے کہ اگر سارے بھولے اور بھولیاں دُنیا سے گزر گئے تو کیا بنے گا اِس دُنیا کا ـــ!

پھر دُنیا بدلی ـــــ اور فقط اُن بچوں کو جو فطری اور پیدائشی طور پر بھولے ہوتے تھے، ''سائیں'' کہنے کا رواج زور پکڑ گیا۔ سائیں مشہور کردینے کا اُن کے بڑوں نے بڑا فائدہ اُٹھایا، وہ یہ کہ نذر و نیاز خواہ مخواہ خود سے چل کر گھر آنے لگی، جس کسی کو خوف زدہ کرنا مقصود ہوتا، سائیں بادشاہ کو سکھا پڑھا کر بددُعا کروادی جاتی، جس سے اگلا خوف سے کانپنے لگتا، اور فوراً کفارے میں مزید نذر و نیاز، خوش کرنے کو حاضرِ خدمت کرنا شروع کردیتا، جس کا دُور دُور تک چرچا کیا جاتا۔ وہ لوگ بڑے سائیں کو تو ٹرخا دیتے اور خود اُس نیاز سے موج اُڑاتے ـــــ عین اِس موقع پر کہ حقیقی بھولے اور بھولی کی سیٹ خالی ہوگئی ہے، تب اِس سیٹ پر سمجھدار بھولوں اور بھولیوں نے مستقل بھولا بن کر قبضہ کرلیا۔ اُن کا اِس مرتبے پر فائز ہونا تھا کہ عہدِ جدید میں معاشرتی اور سماجی انقلاب آ گیا۔ اِس انقلاب نے سوچ و فکر کے دھارے تبدیل کرنا شروع کردیئے، جس سے معاشرے میں کئی طرح کی تبدیلیوں نے جنم لیا۔ جس سے محسوس ہوا کہ نیا زمانہ بھولے اور بھولیوں کے اقتدار کا زمانہ ہے۔ اِن کے آتے ہی وہ بڑے جو اُن سے پہلے اِن کی معصومیت کے قائل تھے اُن کے گرویدہ اور مریدِ بے دام ہوگئے۔ کیونکہ نہ وہ قدیم بھولے بھولیاں رہیں اور نہ وہ معصومیت کے پروانے، دیوانے اور فرزانے رہے۔

سمجھ میں کچھ یوں آیا کہ موجودہ عہد کے بھولے فطری طور پر بنے بنائے نہیں ہوتے، بلکہ بنائے جاتے ہیں ـــــ بلکہ زیادہ ایسے ہیں جو اتنے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ اپنی ذہانت کے زور سے خود ہی بھولے یا بھولی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ اور جب اور جہاں موقع ہوتا ہے لبادہ اُتار کر نارمل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک حیرت زدہ کردینے والی تمثیل ہے، جس کی تہہ تک کسی مناسب سے نارمل انسان کا پہنچنا اور سمجھنا

مشکل کھیل ہے۔ اس میں سب سے اہم بات موقع ہوتی ہے کہ اُس لمحے کو گرفت میں لینا کہ کب اور کہاں بھولے اور بھولپن کا لبادہ زیب تن کرنا ہے، اور کسی مقام پر بھولپن کے بوسیدہ اور گلے سڑے لبادے کو اُتار پھینکنا ہے اور نیا چولا اپنی ذہانت کی زینت بناتا ہے کہ کوئی اندازہ ہی نہ کر سکے کہ کیا ہوا، کیسے ہوا اور کس طرح ہو گیا۔ تمام بھولے اور بھولیاں جو خود ساختہ بھولے بھالے ہوتے ہیں وہ اِس کسب کے زبردست ماہر اور پتے باز ہوتے ہیں۔ اُن کی سیاست، مکاری، فریب کاری اور بھول سازی عام آدمی کی علمی اور عقلی پہنچ سے اِس طرح باہر ہوتی ہے کہ جیسے کسی بچے کا اُڑتے ہوائی جہاز کو ہاتھ بڑھا کر پکڑنا ـــــ چونکہ یہ ناممکنات سے مشتق ایک عمل ہے بس یہی خود ساختہ بھولے اور بھولی کا بہترین چولا اور طرزِ عمل ہوتا ہے کہ جس تک رسائی کسی صورت میں بھی قابلِ عمل نہیں ہوتی۔

بھولا اور بھولی بڑے کمال کے شاطر ہوتے ہیں۔ شاطر اُس کو کہا جاتا ہے جو موقع کی مناسبت اور حالات کے موسم کے حساب سے شطرنج کی چال چلتا ہے۔ شطرنج کی سادہ اور عام فہم چالیں تو مشہور عام ہوتی ہیں مگر جو چال اِس موقع پر بھولا اور بھولی چلتے ہیں وہ سب سے نرالی اور انوکھی ہوتی ہے۔ اُس کی تہہ تک فوری طور پر پہنچنا ایک باقاعدہ سائنس ہوتی ہے۔ یہ سائنس ہر کوئی نہیں جانتا، سوائے بھولوں کے ـــــ بھولے اِسی چال کے سبب اگلے بھولے کو فوراً پہچان لیتے ہیں، مگر کبھی نہیں بتاتے کہ وہ بھی بھولے ہیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ پہلا بھولا، دُوسرے بھولے پر چال اُلٹا دیتا ہے۔ دُوسرا بھولا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ ٹکراؤ دو بھولوں یا بھولیوں کے درمیان ہے۔ اگلے مرحلے میں وہ ایک دُوسرے پر اپنی مکاری کے بھولے جال پھینکتے ہیں۔ اگر کوئی داؤ میں پھنس جائے تو واہ وا ـــــ اور اگر نہ پھنسے تو ہاتھ ملا کر اپنی برادری کا اقرار کر کے دو آرنے بھینسوں کی طرح

ڈکارتے ہوئے دُنیا کے جنگل میں اپنی اپنی راہ بدمستی کے ساتھ لیتے ہوئے چلے جاتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ زندگی میں یہ ٹکراؤ دوبارہ نہ ہو ۔۔۔!

بھولوں کے مقابل بھولیاں بڑی کینہ پرور اور مکار ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب دو بھولیاں آمنے سامنے ڈٹ جائیں تو مرتے دم تک ڈٹی رہتی ہیں۔ ایک دُوسرے کو قدم قدم پر فریب دیتی ہیں، اور مات کی چال سے مارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بھولیوں میں یہ خصوصیت مرد بھولوں سے زیادہ مستحکم اور انتقامی حد تک پائی جاتی ہے کہ وہ ایک دُوسرے کو جان لینے کے باوجود بھی اپنی اپنی راہ لے کر نیا شکار تلاش نہیں کرتیں، بلکہ شکار در شکار کرنے کی ماہر ہوتی ہیں۔ بھولی میں یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے گزیدہ شکار کو بھولتی نہیں ہے، اُسے ہی بار بار شکار بناتی ہے۔ یہاں تک کہ شکار شدہ اُس کو اپنا مائی باپ تسلیم کر کے اُس کے حلقۂ ارادت میں گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ وہاں بھی اُسے معاف نہیں کرتی، اگر کوئی دُوسرا شکار نہ ملے تو اُسے ہی بار بار ڈستی ہیں، خون چیتی ہیں اور اپنے نئے اور تازہ زہر سے آلودہ کرتی رہتی ہیں۔ اَب عام طور پر کہا جانے لگا ہے کہ بھولی کا ڈسا، تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے۔ جب مُر جاتا ہے تب بھی بھولی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اُس کی کردار کشی کرنا شروع کر دیتی ہے؛ اُس سے اُس کو بہت رُوحانی سکون ملتا ہے۔ مرے ہوئے شکار کو ڈسنا بھولی کی فطرت میں ہوتا ہے جبکہ مرد بھولوں میں یہ شغل شاذ شاذ ہی پایا جاتا ہے۔

بھولے اور بھولیاں کینہ پروری میں یکتائے روزگار ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر اُن کے بھولے پن کا کاروبار اِسی یادداشت پر دارومدار کرتا ہے۔ شکار کی چھوٹی سے بات کو پکڑ کر اپنے مطلب کے مقام پر لانا، کوئی اُن سے سیکھے، اور پھر اُس چھوٹی سی بے ضرر بات کو وہ ایسے پھیلاتے اور نکتہ رسی اختیار کرتے ہیں کہ بے اختیار زبان سے

عش عش نکل جاتا ہے۔ جب وہ اُس چھوٹی سی بات کو بڑی بات میں کنورٹ کر چکتے ہیں تو بڑی آسانی سے شکار کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں کہ شکار کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہوا کیا ____

اِن بھولے اور بھولیوں میں یہ خصوصیت بھی زبردست حد تک پائی جاتی ہے کہ بہت بڑی بات کو، جو خصوصاً اُن کے خلاف جاتی ہو، بہت غیر اہم قرار دے کر اپنی جان چھڑا لیتے ہیں۔ دُوسرا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے، اور کہتا ہے کہ بلا کا تحمل اور بُردباری ہے اِن میں۔ انسان ہو تو اِن جیسا بڑے دل کا ہو، ورنہ نہ ہو ____ !

یہ بھولے طرح طرح کے اور ہر طرح کی عمر کے پائے جاتے ہیں۔ صرف اُن کی آنکھیں بولتی ہیں۔ اگر کوئی آنکھوں کی یہ زبان پڑھ اور سمجھ سکتا ہے تو ٹھیک، ورنہ اُسے شکار ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اِن کی آنکھوں کی زبان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اُن بھولی آنکھوں سے سوال تیروں کی طرح اُچھل اُچھل کر وار کر رہے ہوتے ہیں۔ باقی تمام جسم کی باڈی لینگوئج بڑی پُر سکون اور اطمینان کا پُر وقار اور پُر تحمل نمونہ ہوتی ہے۔ اِس اشتراک سے اُن کی بھولی بھالی واردات کامیابی کے جھنڈے گاڑتی ہوئی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور فتح کے شادیانے بجاتی ہوئی اگلی واردات کے لئے تازہ دم ہو جاتی ہے۔ جبکہ شکار ہونے والے کی جھنجھلاہٹ، بے قراری اور ناانصافی کا غصہ، بھولوں کے لئے امرت دھارے کے درجہ رکھتا ہے۔ دُوسرا جس قدر غصے اور پریشانی میں ہوگا، بھولا یا بھولی اُسی قدر کامیابی محسوس کرے گا۔ کیونکہ اُس کو پتہ ہے کہ غصہ اور بے چینی اور اضطراب انسان سے غلطی کرواتا ہے، اور بھولے نے غلطی ہی کا تو فائدہ اُٹھانا ہوتا ہے۔ بھولا بار بار شکار کو باور کراتا ہے کہ تمہارا غصہ اِسی بات کی دلیل ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اگر تم سچے اور کھرے ہوتے تو تم کو کبھی غصہ نہ آتا۔ تم میری طرح گول گول ہوتے۔ اِس موقع پر بھولا سیاست کا آخری داؤ مارتا

شروع کرتا ہے اور پُر سکون لب و لہجے میں سامنے والے کو تاؤ پر تاؤ دلاتا ہے۔ جب وہ تاؤ میں آتا ہے تو بھنبھور کر کھا جاتا ہے۔ اِس موقع کا تو اُسے انتظار ہوتا ہے جس کے لئے اُس نے اپنی مکاری اور فریب کے جال بُنے تھے۔ جس کو شکار کرنا مقصود ہوتا ہے اُس کو بُری طرح اپنی بکری باتوں سے جگہ جگہ ڈستا ہے، اور اُس سے ہونے والی تکلیف کو شکار کی کمزوری قرار دے کر اُسے جھوٹا اور قصوروار ثابت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بھولا کامیاب ہو جاتا ہے اور مظلوم مارا جاتا ہے — اَب بھولا بھولا ہی رہتا ہے اور آپ کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے — یہی بھولے کی کاری گری کا اعلیٰ ترین مظاہرہ ہوتا ہے۔ سب سمجھنے کے باوجود متاثرہ شخص نہ بھولے پر الزام تراشی کی ہمت کر سکتا ہے اور نہ ہی اُس بھولے پنچھی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ گویا بھولا یا بھولی گولی دینے اور پتے بازی میں کمال مہارت کے درجے پر بلا مبالغہ فائز ہوتے ہیں۔

بھولے اور بھولیاں واردات ڈالنے سے کئی ماہ بلکہ کئی سال پہلے وجہ نزع کا بیج بُوتے ہیں۔ پھر یاد رکھتے ہیں کہ یہ بیج کس مقصد کے لئے کس جگہ، کس چال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بویا گیا تھا۔ بیج بُو کر کئی لوگوں کو بے وقوف اور احمق بنا کر اپنا ہم خیال بناتے ہیں۔ اُس بیج کی آبیاری اُن احمقوں سے کراتے ہیں اور خود بھولے بنے رہتے ہیں۔ پھر اُس بیج سے جو پودا عیاری اور مکاری اور فریب کا نکلتا ہے اُسے دُوسروں کی نظروں سے چھپا کر دھیرے دھیرے پروان چڑھاتے ہیں۔ اِس دوران بھول کر بھی اُس کا ذکر اپنی زبان پر نہیں لاتے۔ پھر جب وہ واقعہ، اُن کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے تو واویلا مچا کر سب کو متوجہ کرتے ہیں۔ جتاتے اور کہتے پھرتے ہیں کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ ایسا ہوگا۔ دیکھ لو، ویسا ہی ہوا ہے۔ یہ بھولے کا

سب سے شاطرانہ وار ہوتا ہے جو کبھی خطا نہیں جاتا۔ اِس وار کے بعد بھولا بے گناہ اور معصوم اور مخلص کہلاتا ہے۔ بس یہی بھولے کا ذُر مقصود ہوتا ہے۔ اور اِسے کہتے ہیں بھولے اور بھولی کی معصومانہ واردات۔ اِس موقع پر تمام لوگ بھولے کو عاقل کہتے ہیں اور متاثرہ شخص کو لعنت ملامت کرتے ہیں ـــ بھولا صرف خاموشی سے مسکراتا ہے اور جامِ فتح چسکیاں لے لے کر خاموشی سے نوش جان کرتا ہے، اور اگر یہ واردات بھولی نے کی ہو تو وہ نئے کپڑے پہن کر اِترائی اِترائی پھرتی ہے، اور پھولی نہیں سماتی۔ اُس وقت اُس کی اِتراہٹ قابلِ دید ہوتی ہے، اور پیر اُس کے زمین کی بجائے فضا میں رقص کر رہے ہوتے ہیں ـــ !

بھولے اور بھولی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر آپ اُسے کچھ سمجھا رہے ہوتے ہیں تو وہ مخلصی اور خاموشی کے ساتھ دو گھنٹے کا لیکچر سنے گا۔ مگر آپ کی کسی بات سے ذرہ بھر بھی اختلاف نہ کرے گا، اور نہ ہی آپ سے مباحثہ کرے گا۔ بس کبھی کبھار ذرا سی ہوں ہاں ہُو پلے منہ سے کرتا جائے گا (یہی عمل بھولی کرے گی) تاکہ سمجھانے والا مزید بھونکے۔ آخر میں کوئی عجیب سا بہانہ کر کے بات کی طاقت کو بے اثر کر دیا جائے گا، اور وہاں سے کھسک لے گا۔ بات کا نتیجہ ڈھاک کے تین پات کی صورت نکلے گا۔ بھولا وہی کرے گا، جو اُس کے دماغ میں خنّاس کی طرح جما ہوگا۔ آپ کی کہی بات کو دل ہی دل میں مادر زاد گالیوں سے نواز رہا ہوگا، اور فقط گتے کی بھونک سمجھے گا۔ یہ بھولے یا بھولی کی سب سے اعلیٰ خصوصیت ہے جو ظاہر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہو جائے تو وہ بھولے نہیں رہتے۔ اُن سے کوئی جیت نہیں سکتا، اُن کو ہر بات کا توڑ اور ہر بات کی راہ آتی ہے۔ اُن کو سمجھنا آسان نہیں، اِس لئے کہ بھولے اور بھولی گتے کی وہ دُم ہوتے ہیں جو نلکی سے سو سال بعد بھی ٹیڑھی نکلی تھی ـــ !

خط

بیت گئے وہ زمانے کہ جب خط لکھے جاتے تھے؛ گذر گئے وہ شب و روز جب خط کا انتظار ہوا کرتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے خط نویسی اپنی موت آپ مر گئی ہو، یا کسی نے مار دیا ہو۔ اِس موقع پر میں یہ کہوں گا کہ ہم سب کو پتہ ہے کہ خط اور خط نویسی کا قاتل کون ہے، وہ الیکٹرانک میڈیا کہ جس نے صدیوں پرانی زندہ روایت کو راتو رات گلا گھونٹ کر مار دیا، اور خط کے سنگھاسن پر خود بن سنور کر نہ صرف براجمان ہوئی بلکہ ایسا تصرف بے جا اور شب خون مارا کہ خط کہیں کا نہ رہا، اُس کا نام تک مٹ گیا۔ اَب وہ خط رہے، نہ ہی خط لکھنے والے رہے، اور نہ ہی اُن کے لکھنے، وصول پانے اور

پڑھنے کا بے تابانہ رجحان رہا ـــــ خط نہ رہا تو اُس کا انتظار کیسا بلکہ حد یہ گزر گئی کہ خط لانے والے ڈاکیے کا، جس کا کبھی محبوب سے زیادہ انتظار ہوا کرتا تھا، وہ بھی خط کی موت کے ساتھ وفات پا گیا ـــــ گویا خط سے وابستہ سارے رومان دم توڑ گئے۔ وہ محبوبہٗ دل نواز کا خط کو اپنے گریبان کی گولائیوں میں ہفتوں چھپائے رکھنا، بار بار اُوٹ میں جا کر خط کے مضمون میں پنہاں مضمون کو بار بار تلاش کرنا، محبوب کی اُنگلیوں کی خوشبو کو سونگھنا، خط پڑھنا آئے یا نہ آئے، اُس کے کاغذ کے حسین لمس کو اپنے بدن کی حدت سے زیادہ طرب ناک اور وجد انگیز پانا، یہ سب خطوں کے دم سے تھا۔ خط محبت کے علم بردار اور پیامبر ہوا کرتے تھے۔ اُن سے محبتوں کے چراغ روشن رہتے تھے۔ اس قدر خط کی قدر و منزلت تھی کہ مدتوں، سالوں بلکہ صدیوں، صندوقوں اور دل کے جھروکوں میں سنبھال کر رکھے جاتے تھے۔ خط کا مضمون تو پیارا ہوتا ہی تھا مگر اُس کا کاغذ اُس سے زیادہ دل کا دُلارا ہوتا تھا، اور خط کا لفافہ بھی اتنا اہم ہوتا کہ بعض مرتبہ اُس لفافے کے اِتنے بُوسے لئے جاتے کہ حجرِ اسود کا گمان ہونے لگتا۔ خاص طور پر لفافہ جس جگہ اور تکونی سمت سے بند کیا جاتا، اُس پر تو بُوسوں کی برسات ہوتی رہتی تھی، کیونکہ رواج یہ تھا کہ لفافہ بند کرنے کے تکونے مقام پر گوند کا لیپ محکمہٗ ڈاک کی طرف سے ہوتا تھا، اور محبوب یا محبوبہ اُس گوند کو اپنے ہونٹوں اور زبان کا رسیلا لُب لگا کر بند کیا کرتے تھے۔ گویا ہونٹوں اور زُبان کی مُہرِ محبت اُس پر ثبت ہوتی تھی۔ ہر کوئی خط کو بے تابی سے پیار کرتا تھا۔ یعنی بادی النظر میں اپنے چاہنے والے کے ہونٹوں تک رسائی پاتا تھا۔ یہ بات سب کو پتہ تھی، اِس لئے اُس جائے لبِ محبوب کے لمسِ لبِ شریں کا احساس اور گرمائی سالوں بعد بھی لفافے کے ذریعے ملتی تھی، اور محسوس کی جا سکتی تھی۔ اور اِسی جگہ پر محبت کے بُوسے ثبت در ثبت ہوتے چلے جاتے تھے۔

کاغذ کی قسمت کے یہ جذبات اور احساسات سے بھرپور بوسے، خط کی رُخصتی کے ساتھ ہی رُخصت ہو گئے۔ نہ وہ خط رہے اور نہ وہ لبِ شریں سے آلودہ لفافے رہے، اور نہ ہی شب کی تاریکی اور دن کے ملگجے اجالوں میں وہ لمس دل ربا رہا ــــ!

بھائی کا خط بہن مدتوں سنبھال کر رکھتی؛ بھائی پر پیار آتا تو صندوق سے نکال کر اس کے مہینوں پرانے خط کو چومتی، سینے سے لگاتی، آنکھوں میں آنسو بھر کر پیار کرتی، دُعائیں دیتی، اور پھر کلیجے سے الگ کر کے دوبارہ صندوق کی حفاظتی تہوں میں سنبھال دیتی، کسی دُوسرے دن کی محبت کی تڑپ کو سکون دینے کے لئے ــــ!

شوہر کا خط، خواہ وہ محاذِ جنگ سے آتا یا سات سمندر پار انگلستان سے؛ انتظار میں بیٹھی، اپنی آگ میں خاموشی سے جلتی سہاگن کا سندھور ہوتا تھا۔ وہ اس خط کو راتوں کی بانجھ تاریکی میں سینے سے لگا کر سرگوشیاں کرتی، باتیں کرتی، محبت کے شکوے کرتی، پیار کی ادھوری کہانیاں سناتی، نخرے کی ادائیں دکھاتی، کبھی محبت سے آنسو بہاتی اور کبھی کلیجے پر پتھر کی سِل کو رکھ کر اس سے اُلفت کرتی، اپنے سینے کی ہر اوٹ ہٹا کر دل سے کھول کھول کر لگاتی، اور پھر جب رُوح اور جسم کو تسلی ہوتی تو اسی کو دل سے لگائے گہری اور پُرسکون نیند میں ڈوب جاتی، اور صبح کو اُسے اپنے عریاں سینے سے الگ کر کے پھر کسی ایسے بے قرار وقت کے لئے سنبھال دیتی ــــ!

محبوب کا خط محبوبہ کے لئے اور محبوبہ کا خط محبوب کے لئے، کسی آسمانی صحیفے کا سا تقدس اور محبت کا جذبہ رکھتا تھا۔ دُوسری سمت یہ محبت نامے اتنے قیمتی اور نادر ہوتے کہ ان کی اہمیت خزانۂ قارون سے زیادہ ہوتی تھی۔ گویا اس میں لکھے لفظ سرمایۂ اُلفت کا لازوال خزانہ ہوتے۔ ایسا حسین سرمایہ کہ جس پر دل و جان فدا ہوتی بلکہ بار بار فدا اور فریفتہ رہتی، اور چین نہ پاتی تھی۔ ایک بار نہیں، ہزار بار پڑھے جاتے، یہاں

تک کہ لفظ لفظ رٹ جاتا، دل پر نقش ہو جاتا، حدیث و آیت کریمہ کی طرح حفظ ہو جاتا، مگر جو چین اور سکون اُسے بار بار پڑھنے اور کھول کر دیکھنے سے ملتا، وہ کہیں اور نہ ملتا تھا۔ نئے خط کے مزید پہنچنے تک یہ خط، صحیفۂ محبت کا مقام پائے رکھتا۔ پھر جب انتظار کی طویل رات کے بعد نیا خط سحر بن کر طلوع ہوتا تو وہی عمل محبت دوبارہ دہرایا جاتا۔ محبتوں کے یہ عمل خطوط کے مرہونِ منت تھے کہ ہر بات کا جواب، طویل انتظار کے بعد آتا۔ اس طرح سے ساری باتیں خواہ وہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو، زندہ جاوید رہنے کا احساس ہر وقت جاگتا رہتا۔

یہ درست ہے کہ ایسے بہت سے خطوط کا مقدر آخر کار آگ ہوتی تھی۔ محبت کی آگ، رُسوائی سے بچنے کے لئے آگ، کسی کی آنکھ سے اوجھل رکھنے کے لئے آگ، یا پھر زمانے کی دست برد سے بچانے کے لئے آگ ہی کے سپرد کئے جاتے تھے۔ یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اپنے خون کے رشتے اُسے رُسوائی سمجھتے ہوئے شقی القلبی کے ساتھ سپردِ آگ کر کے قلبی سکون محسوس کر کے تحفظ کا احساس پاتے تھے۔ بہت کم ایسے محبت نامے تھے کہ جن کے مقدر میں آگ نہیں ہوتی تھی، اور جن کے مقدر سکندر ہوتے تھے؛ وہ دائمی حیات پاتے تھے۔ بعض مرتبہ تو ادبِ عالیہ کا حصہ بن جانے کی سعادت سے بہرہ مند ہوتے تھے، بس وہی خطوط کتابوں میں آج بھی زندہ ہیں ـــــ!

خطوط کی ترسیل سے ایک دُنیا قائم تھی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں دُور تک بانٹی جاتی تھیں۔ دُکھ میں سب پوری شدت اور غم کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ خط محبتوں، نفرتوں اور دُکھوں کے لازوال پیارے تھے۔ پھر دُنیا میں سوچ کا ایک نیا تصور اُبھرا، ایک نیا طوفان آیا جو خط اور خط کی روایت کو بہا کر لے گیا۔ اس کی جگہ ای میل، ایس

ایم ایس اور ٹیلی فون نے لے لی۔ اُس کی دو وجوہات بیان کی گئیں کہ یہ سروس تیز ترین اور کم خرچ ہے۔ مگر غور سے دیکھیں تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ خط کے مخالفین کی حماقت پر مبنی سوچ لگتی ہے، وہ اس طرح کہ ای میل کرنے کے لئے ہزاروں روپے کا سیٹ اُپ اور رابطے قائم کرنے کے لئے پورا سائنسی نظام چاہئے۔ اور پھر اُس کو استعمال کرنے کے لئے خاص طرح کا علم بھی ضروری ہے، تب جا کر فوری ترسیل خط ممکن ہوتی ہے، ورنہ ہرگز نہیں۔ جبکہ خط کے لئے معمولی سی تعلیم، کاغذ اور ٹوٹا پھوٹا قلم بھی کام دے دیتا ہے، اور پھر چند سکوں میں خط یہاں سے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ خط مدتوں سنبھال کر رکھے جاتے ہیں، اور جب خیال آیا نکال کر دیکھے بھی جا سکتے ہیں جبکہ کمپیوٹر خراب ہو جائے تو چند روپے میں ہرگز ٹھیک نہیں ہوتا، بجلی نہ ہو تو پرانا ای میل دیکھا نہیں جا سکتا، ای میل کا پاس ورڈ گم ہو جائے تو سب کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ اِس کے مقابل خط میں ایسا نہیں ہوتا، جب تک کہ خط کو خود ضائع نہ کیا جائے۔ پھر ایس ایم ایس آ گیا۔ اُس کے لوازمات بھی قیمتی ہیں۔ ہر کسی کو نہ ایس ایم ایس کرنا آتا ہے اور نہ کھول کر پڑھنا آتا ہے۔ اور بالآخر ضائع اُس کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ بس اُس کا سب سے بڑا مزا یہ ہے کہ اُس کے آنے اور جانے کا کسی کو کانوں کان پتہ نہیں چلتا؛ کاروبار ہو یا عشق بڑی تیزی سے پروان چڑھتا ہے، اور دیکھنے میں یہ بھی آیا کہ اُسی تیزی سے رُخصت بھی ہو جاتا ہے۔ تار، یا خط، یا ای میل سے زیادہ تیز اُس کی ترسیل ہے۔ ایس ایم ایس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ غلط فہمی بہت جلد پیدا کرتا ہے، سو اُس کی وجہ سے فساد اور بے عزتی فوری طور پر ہو جاتی ہے۔ شکریہ بھی فوراً ادا ہو جاتا ہے، دھمکی بھی تیز رفتاری سے دی جا سکتی ہے۔ اور کئی کام ہیں جو شارٹ میسج سروس، بہت تیز رفتاری سے انجام دے کر اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ اِس وجہ سے قاتل بھی پکڑے جاتے

ہیں مگر کبھی کسی بے گناہ کو اِس کی وجہ سے نجات پاتے کبھی نہیں دیکھا۔ موجودہ زمانے میں عشق کا شارٹ کٹ ایس ایم ایس سے ہی لگتا ہے۔

اِن سب کے مقابل خط ایک پُرسکون طریقہ رابطہ ہے۔ گو دھمکیاں، شرارتیں اور شکایتیں شاطر لوگ اِس کے ذریعے بھی کرتے ہیں، مگر جلدی پکڑے جاتے ہیں، یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر اِس میں زندگی کی قربت کا احساس جامد اور بے حسی پر مبنی نہیں ہوتا۔

مثلاً میکے کے گھر سے آئے خط کی قدر اُس بیٹی سے پوچھیں جو اپنوں سے سینکڑوں میل دُور بیٹھی ہے۔ کبھی اُسے اپنا اکلوتا بھائی یاد آتا ہے، اور کبھی اماں اور اماں کی بے لوث محبتیں، اور کبھی وہ ابا مرحوم کو یاد کر کے آنسو بہاتی ہے۔ وہ خط کو کس نظر سے دیکھتی اور شدت سے یاد کرتی ہے، یہ کوئی اُس کے دل سے پوچھے تو کچھ اندازہ ہو۔ اور جن یادوں کے دیپ اُس کے دل و دماغ میں چراغاں کئے ہوئے ہیں، اُن کا اندازہ اُسی کے لفظوں سے ہی کرنا ممکن ہے۔ وہ ایک خط لکھتی ہے — !

پیارے بھیّا! میرے راج دُلارے بھیّا

آپ کی خدمت میں سلام اور اماں کی خدمت میں آداب — بھائی آج پورے پندرہ دن ہو گئے ہیں کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں اِس ویرانے میں فقط تمہارے خط کے سہارے جیتی ہوں۔ کہاں لاہور اور کہاں نوشکی — مجھے تو لگتا ہے کہ زمین و آسمان کے برابر یہ فاصلہ ہے۔ یہ بھی سوچتی ہوں کہ کوئٹہ میں تمہارا خط اللہ کے فضل سے تیسرے دن ہی مل جاتا تھا — مگر بھائی یہاں کی نہ پوچھو، آٹھویں دن بھی مل جائے تو غنیمت جانو۔ یہاں بڑا مزا آتا ہے، جب پوسٹ مین بستی میں داخل ہوتا ہے تو — گلی میں آتے ہی آواز لگاتا ہے، پوسٹ مین —

سب عورتیں، مرد فوراً اس آواز پر اپنے اپنے گھر کے دروازے پر آجاتے ہیں۔ رشتے داروں کے خطوط کا یہاں بڑا رواج ہے، جبکہ کوئٹہ میں پوسٹ مین کے آنے پر یہ چہل پہل نہیں ہوتی تھی۔ پھر جس کسی کا خط آتا ہے تو سب لپک لپک کر معلوم کرتے ہیں کہ کس کا خط آیا ہے۔ سب ایک دُوسرے کے خط مل کر پڑھتے ہیں کیونکہ سب ایک دُوسرے کو خاندانی طور پر جانتے ہیں۔ بوڑھی عورتیں تو بالکل پڑھنا نہیں جانتیں، البتہ نوجوان لڑکیوں میں تعلیم ہے، وہی پڑھ کر سُناتی ہیں، اور سناتے ہوئے بعض باتوں پر آنکھیں مٹکا مٹکا کر مزے بھی لیتی جاتی ہیں۔ خط کے آنے پر بڑا اپنا اپنا سا ماحول بن جاتا ہے، ایسا میں نے بڑے شہروں میں نہیں دیکھا۔ کسی کا میاں، دُوسرے ملک سے خط بھیجے تو بڑی رازداری ہوتی ہے، پھر تو اور مزا آتا ہے، جو باتیں ذرا چھپانے کی ہوتی ہیں، وہ خط پڑھتے وقت تو چھپائی جاتی ہیں مگر شام تک پوری گلی کو معلوم ہو جاتی ہیں۔

جب سے یہاں آئی ہوں، دل بہت زیادہ اُداس رہنے لگا ہے۔ اُن کی پوسٹنگ ایسے ویرانے میں بھی ہو نا تھی، یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مگر خیر اَب تو ہو گئی ہے، صبر اور شکر ہے۔ مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھتی ہوں تو دُور دُور تک ویرانہ اور سنگلاخ شہر ہے، رات کو گیدڑ بولتے ہیں۔ ہاں یہاں یہ بات ضرور ہے کہ رات کو آسمان تاروں سے دُلہن کی طرح بھرا بھرا نظر آتا ہے، جیسے کوئی کالا دوپٹہ سفید اور کچی کامدانی سے بھرا پڑا ہو۔ یہ منظر شہروں میں رات کو آسمان پر نظر نہیں آتا تھا۔ عجیب عجیب تاروں بھری کائناتیں آسمان میں بکھری ہوئی عام نظر آتی ہیں۔

ذرا ٹھہرنا ـــــ تمہاری چھوٹی بھانجی نے نیکر میں پیشاب کر دیا ہے، اُسے سنوار دُوں تو باقی خط لکھتی ہوں۔

(اَب خط کے نئے مضمون میں قلم اور سیاہی بدلتی ہے اور نئی تاریخ

ڈالی جاتی ہے۔ گویا اگلے دن باقی خط لکھا گیا ہے۔)

بھیا ___ آج بھی ڈاکیا محلّے میں آ کر چلا گیا، مگر تمہارا خط آج بھی نہیں آیا۔ پورے سولہ دن ہو چکے ___ باتوں کی جھونک میں اماں کا حال پوچھنا تو بھول ہی گئی۔ یہاں فون کے سگنل نہیں آتے جو تم سب سے بات ہو سکے۔ پتہ نہیں کس ویرانے میں لا پھینکا ہے ___ پر میں اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ یہاں کے سنگلاخ ویرانوں میں بھی خوش ہوں، وہ بہت اچھے انسان ہیں، میرا بہت خیال رکھتے ہیں، پھول کی چھڑی بھی مجھے چھو جائے تو دیوانے سے ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے مالک پاک کا کہ تم نے ایسے اچھے آدمی کے پلّے مجھے باندھا، ورنہ میں تو مر ہی گئی ہوتی۔ اماں سے کہو کہ وہ کوئی اچھی سی، من موہنی سی نیک اطوار لڑکی دیکھ کر تمہارا بیاہ بھی کر دیں۔ بہو کے ہاتھ کا کھانا کھانے سے، مجھے یقین ہے کہ اُن کی صحت بہتر اور عمر دراز ہو جائے گی ___ اور تم کب تک اُن کی بوڑھی جان کو چولہے میں جھونکتے رہو گے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اُن کا بڑا خیال رکھتے ہو۔ اِس پر اُن کو بڑا ناز ہے ___ میری شادی پر لیا قرضہ اُتر گیا ہو تو تم فوراً بیاہ کر لو میرے پیارے بھیا ___ اور اگر اَب تک کوئی چنچل سی لڑکی ہمارے بھیا کے دل کو بھا گئی ہو تو میں جلدی سے آؤں لاہور ___ ؟ ہاہاہا ___ !

کل مجھے ابّا، اماں اور تم بہت یاد آئے۔ ایسا دل بھر کے آیا کہ شام کو تو ضبط نہ ہو سکا۔ ایسی دھاڑیں مار مار کر روئی کہ پھر جا کر دل ہلکا ہوا اور سکون کی نیند آئی۔ تمہارے بہنوئی مجھے روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگے، اُن کو روتا دیکھ کر تینوں بچے بھی رونے لگے اور پھر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ مُنّی کو روتا دیکھ کر بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ یکدم سب نے رونا چھوڑ کر مجھے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رات ہم نے بڑے دنوں بعد قیمہ مٹر بنائے۔ تمہارے بہنوئی پتہ نہیں کہاں سے یہ چیزیں لے آئے تھے،

کہہ رہے تھے کہ کسی کے ہاتھ کوئٹہ سے خاص طور پر میرے لئے منگوائی ہیں۔ میں نے پکانے کے بعد جب سب دستر خوان پر آ گئے تو وضو کر کے اُن کے مرحوم ابا، اماں اور اپنے ابا کا فاتحہ دیا، اور پھر ہم نے مزے لے لے کر کھایا۔

جیسے ہی اُن کو چھٹی ملتی ہے، میں لاہور آؤں گی۔ تم ذرا جلدی جلدی خط لکھ دیا کرو، اس سے دل کو تسلی اور روح کو قرار آ جاتا ہے۔ اَب وہ آنے والے ہیں، باقی باتیں تمہارا خط آنے پر خوب ہوں گی۔ اماں کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ سلام اور تم کو بھیا بہت سا پیار۔ تینوں بچے سب کو زور زور سے آداب کہہ رہے ہیں، جب میں کچھ بھی لکھنے بیٹھتی ہوں تو بچے سمجھتے ہیں کہ ماموں اور نانی کو خط لکھ رہی ہوں۔ حالانکہ دھوبی کا حساب لکھ رہی ہوتی ہوں۔ باتیں اتنی ہیں کہ کبھی ختم نہ ہوں مگر تمام کرتی ہوں۔

دُعاؤں کی محتاج، تمہاری بہن — از نوشکی — ”

نوکرانی

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ نوکرانی ایک عجیب و غریب اوصاف اور کردار کی حامل ایک زنانہ مخلوق بہ شکل آدمی ہوتی ہے۔ یوں تو اِس مخلوق کی بے شمار اور طرح طرح کی اقسام پائی جاتی ہیں، مگر موٹی موٹی دو قسمیں عام ملتی ہیں۔ عارضی قیام والی نوکرانی، اور دائمی قیام والی نوکرانی ـــ عارضی قیام والی نوکرانی بھی بڑی سیانی اور جوڑ توڑ کی ماہر ہوتی ہے، اور اُن میں مزید ایسی ایسی چلتر اور رنگ باز ہوتی ہیں کہ اللہ کی پناہ ـــ عارضی نوکرانی اصل میں وہ ہوتی ہے کہ جو بنیادی طور پر جز وقتی ملازمت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ گویا اُس کا قیام اور طعام، ملازمت کے مقام پر مستقل

بنیادوں پر نہیں ہوتا ـــــ مگر اور اگر اُس میں خاص الخاص صلاحتیں اور اُس کے ساتھ ذرا سا رنگ رُوپ اور تھوڑا سا مکاری کا شوربا، جوانی کا تھوڑا سا بدذائقہ خمار، اور گھر کے مالک میں عقل و ہوش نام کی شے کی کمی ہو یا مالک اُس کی کھوٹی جوانی کی کریم لگی چمک اور اداؤں کی پھسلن سے پھسل جائے تو یہ مخلوق بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر کے دائمی قیام کی جگہ بنا لیتی ہے، اور ایسی ایسی اعلیٰ اور مستقل جگہ بناتی ہے کہ مالکن کو بھی مات ہو جاتی ہے۔ جب مالکن کو مات دینے والی آ جائے تو مالک صاحب کو بھی اپنی خیر منانی چاہیے ـــــ یہی وجہ ہے کہ مادہ نوکر کو دل کی رانی بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی ـــــ !

گویا عارضی اور جز وقتی ملازمہ بھی کمال کی چیز ہوتی ہے، اور اگر خدانخواستہ اُس کی عقل تیز، اُس کے فیصلے جامع اور حالات کے مطابق ہوں اور اُس پر کچھ تھوڑا سا چہرہ مہرہ ذرا سا واجبی، ادائیں اور نخرہ بھی ہو، جو بے شک بھونڈا اور غیر شائستہ ہو، ذرا سا جوانی کا زور ہونے کے ساتھ کمر پتلی اور پھرتیاں پوری ہوں تو پھر کام مکمل ہی سمجھو۔ اور اگر اِس سب کے ساتھ ساتھ اضافی خوبی یہ ہو کہ وہ خاص قسم کے ڈرامائی ٹی وی چینل شوق سے دیکھنے کا تجربہ بھی رکھتی ہو کہ جن میں نوکرانیوں کا لباس، عام گھریلو مالکنوں سے زیادہ چھیل چھبیلا اور رنگین ہو، اٹکنا اور مٹکنا، انگ انگ میں سرائت کرانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، اور عالم تصور میں اپنے آپ کو مالکن کے ہم پلہ دیکھنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ پینترے بازی کی شُد بُد سے بھی آشنا ہو، تو سمجھو کہ واردات پوری ہو جانے کی قوی ترین اُمید ہے۔ ایسی نوکرانی مالکن کو بہت عمدہ طریقے سے بے وقوف اور حضرت مالک کو پوری طرح پاگل بنانے کے اوصافِ حمیدہ کی مالک ہوتی ہے۔ اگر یہ زیادہ عرصے تک کسی گھر میں قیام فرمائے اور مالکن کو

مناسب طریقے سے اپنی شرافت ونجابت وایمانداری کے معصومانہ جال میں جکڑ کر اُلّو بنانے میں کامیاب ہو جائے تو کوئی بعید نہیں کہ کسی دن گھر کی مالکن کو حکم سنائے کہ تم آج سے اپنا بوریاں بسترا گول کر کے اپنا بیڈ رُوم، جس پر تم اِتراتی ہو، فوراً میرے حق میں شرافت سے خالی کردو۔ کیونکہ آج صبح دس بجے صاحب نے بعدالت حضور والا مجسٹریٹ درجۂ اوّل کے رُوبرُو اور حضرت مولانا قبلہ صاحب کی زیرِ نگرانی، قانونی طریقے سے مجھے بھی نئی مالکن کا عہدہ عطا فرما دیا ہے۔ اِس لئے میں آج لیٹ آئی ہوں؛ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب نے بیان لینے میں کافی دیر لگا دی تھی اور پھر میں نے نئے کپڑے، جو تم دیکھ رہی ہو، زیب تن کئے ہوئے ہیں؛ یہ اُسی بوتیک کے ہیں جو تم کو ایم ایم عالم روڈ پر سب سے زیادہ پسند ہے ___ اَب میں تمہارے باتھ رُوم کے ٹب میں نہا دھو کر میک اَپ کرانے جانے والی ہوں کہ جس پارلر والی سے تم میک اَپ کرانے کی شوقین ہوتی تھیں ___ اور ہاں اَب بہتر یہی ہے کہ تم کبھی اُس پارلر میں نہ جانا، کیونکہ آج میں اُس کو بتا دُوں گی کہ صاحب نے تم کو بالکل فارغ کر کے مجھے تمہارا عہدہ اور اختیارات عطا فرما دیئے ہیں۔ اِس کے بعد تم وہاں جاؤ گی تو بڑی رُسوا اور ذلیل ہو گی۔

اور ہاں سنو ___ چونکہ تم نے میرے ساتھ، جب میں نوکرانی ہوا کرتی تھی، بہت اچھا سلوک کیا تھا، اِس لئے تم ساتھ والے کمرے میں رہ سکتی ہو۔ صاحب کو میں نے واپسی پر کہہ دیا تھا کہ وہ تم سے ہفتے میں ایک بار، وہ بھی صرف دن، دن میں مل لیا کریں؛ رات کو تم سے ملنے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ آج سے تم مجھے شہزادی کہا کرو گی، یہ میرا اصلی نام ہے، شیداں کے نام سے بلایا تو یاد رکھنا، وہ تمہارا اِس گھر میں آخری دن ہو گا، اور میں بھی تم کو آج سے باجی نہیں کہوں گی، تمہارا نام لے کر بلایا

کروں گی، کیونکہ اَب ہم دونوں کا عہدہ اور اسٹیٹس ایک جیسا ہے۔ میں کوئی عام گھرانے کی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں، خاندانی لڑکی ہوں اور نہ ہی احسان فراموش ہوں۔ اِس لئے تم ذرا اپنی اوقات میں رہنے کی کوشش کرنا — میں نے یہ اپنا نیا مقام بڑی مشکل سے پیدا کیا ہے، میرے آگے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ آڑے آنے کی ضرورت ہے۔ مجھے صاحب نے بتادیا ہے کہ تم بھی اُن کے گھر نلکے سے پانی بھرنے آیا کرتی تھیں، اور مالکن بن بیٹھی تھیں۔ اَب میرا منہ زیادہ کھلوانے کی ضرورت نہیں ہے، باقی تم اچھی سمجھدار ہو، سب سمجھتی ہو، مجھے سمجھانے یا میری راہ میں کانٹے بچھانے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ میں تمہارا پتہ ہی صاف کردوں گی۔ سمجھ گئی نا —

اور ہاں آخری بات بھی سُن لو، پورے بارہ سال تم نے صاحب کی جوانی اور پیسے کا مزا لیا ہے، اَب میرا حق ہے۔ آج سے تمہارا بیڈ رُوم، میرا بیڈ رُوم ہے — ایک لمبی آہ بھرتی ہے اور کہتی ہے — ہائے کتنے مہینے اِس کمرے میں، اِس نرم و گرم بستر پر اے سی چلا کر، ایئر فریشنر چھڑک کر، نائیٹی پہن کر سونے کے خواب دیکھے ہیں۔ بڑی بی تم کیا جانو — یاد رکھنا تمہارے حسن اور میری جوانی میں بہت فرق ہے۔ بس تمہارے لئے اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ تمہارا وزن بارہ من کی دھوبن جتنا اور کمر، آٹے کی بوری جتنی ہے، اور لو دیکھ لو — میری کمر اور میرا وزن — تمہارا وزن اُٹھا کے تو میرے صاحب کی کمر ہی ٹوٹ گئی ہے — !

بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے، اور وہ پتھر کی مُورت بنی کھڑی، ٹُک ٹُک دیکھ رہی تھی، اور لفظ لفظ سُن رہی تھی، اور عارضی نوکرانی کی قسمت پر رشک کر رہی تھی — اُسے وہ نلکے سے روز پانی بھرنا اور نلکے پر مَل مَل کر اپنی پنڈلیاں دھونے کا منظر یاد آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی یہ شہزادی خاندانی ہے،

کیونکہ شکر ہے کہ اُس نے نکاح کے بعد مجسٹریٹ کے سامنے، صاحب سے مجھے طلاق نہیں دلوادی۔ جبکہ شہزادی دل ہی دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ کیا ترکیب لڑاؤں کہ یہ نکمے والی بھینس، میرا کمرہ ٹھیک کرکے کچن میں میری جگہ روٹی پکایا کرے۔ اِسی لئے تو صاحب سے اِس کو طلاق نہیں دلوائی۔ آخر میرا بھی تو کچھ حق ہے ___ لیکن پتلی کمر والی کو اِس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ یہ کمر اور کس بل، دن رات بھاگ بھاگ کر کام کرنے کا بے لُوث صلہ ہے۔ جب وہ اگلے چھ ماہ اِس کمرے اور بستر پر اینڈے گی تو وہ بھی بارہ من کی دھوبن اور آٹے کی بوری جتنی کر پالے گی، اور پتہ نہیں کہ صاحب اِن دو توپوں کے ساتھ کیسے گزر بسر کریں گے ___ !

اگر کسی مالکن کو پُوچھو کہ تم نوکرانی کے بغیر رہ سکتی ہو تو اُس کا چہرہ ایسے اُتر جاتا ہے کہ جیسے آلو بالو سے چھلکا اُتار دیا گیا ہو ___ گھر کے اُوپر کے کام مثلاً برتن دھونا، کپڑے دھونا، جھاڑو دینا، ٹاکی پوچا لگانا، یہ سب کام گھر کی عورت کو تباہ کردینے کو کافی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر برتن مانجھنے سے جو ہاتھوں کا حشر ہوتا ہے، وہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ سیاہ جھریاں اور ٹوٹے ناخن، ایسی بدنامی پیدا کرتے ہیں کہ کسی نیل پالش سے بھی سنبھالے نہیں جاتے کہ دیکھنے کو دل نہ کرے۔ ویسے سچ بات یہ ہے کہ جس کا کام اُسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ اِس لئے یہ ہر گھر کی مجبوری ہے۔ نوکرانی ایسے ہونی چاہئے جو کام کاج کر کے اگلے گھر جانے کی جلدی میں ہو، یا اتنی بُوڑھی، بدشکل اور بدہیئت ہو کہ اُسے دیکھ کرتے آتی ہو، بدبُو اُس سے اتنی آتی ہو کہ جیسے گٹر کا ڈھکن کھلا رہ گیا ہو، شکل اتنی مکروہ ہو کہ دیکھ لینے کے بعد دو دن متلی نہ رُکتی ہو۔ گھر کی مالکن کو چاہئے کہ اِس نوکرانی کو چار پیسے زیادہ بھی دینا پڑیں تو دے کر رکھ لیں۔

اِس سب کے علاوہ اور بھی کچھ اصولِ زریں ہمہ وقت یاد رکھنے کے ہیں کہ

نوکرانی کو کبھی ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھنے کی اپنے گھر میں عادت نہ ڈالیں، وہ گھر میں قدم رکھے تو ٹی وی فوراً بند کر دیں۔ کام مکمل کرے اور اپنے گھر کو سدھارے کا اصول سب سے محفوظ اصول ہے۔ اپنے گھر کی اندرونی باتیں کبھی اُس کے سامنے نہ کریں۔ یہ لوگ ہر بات کان لگا کر سنتے ہیں، اپنی مرضی کا مطلب نکالتے ہیں، اور پھر اپنی خواہش کے مطابق کارروائی کرتے ہیں۔ اِن سے کسی فیض کی ہرگز توقع نہ رکھیں۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ خدانخواستہ اگر شہر میں بلوا ہو جائے تو یہی نوکرانی اور اُس کا خاندان سب سے پہلے آپ کا گھر لوٹے گا۔ بیویوں کے لئے ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ کوشش کریں کہ میاں صاحب کا سامنا نوکرانی سے کم سے کم ہوا کرے، اسی میں بھلائی اور خیر پوشیدہ ہے۔ یاد رکھیں نوکرانی کی اپنی ذات کے بارے میں بیان کردہ نیکیوں، پارسائیوں اور اعلیٰ خیالات پر کبھی بھول کے بھی بھروسہ نہ کریں۔ بہتر ہے کہ جوان جہان نوکرانی سے اپنے گھر کو پاکیزہ رکھیں، اُس سے اُس کا نہ ہونا، ہزار درجے بہتر ہے ـــــ ایسی کم عقل اور چھوٹے دماغ والی نوکرانی کو رکھنے کی کوشش کریں کہ جس کی عقل گدھے سے بھی کم ہو، اور احساسِ شعور بے حسی پر مبنی ہو۔ یادداشت اور آنکھیں بھی کمزور ہوں تو سبحان اللہ ـــــ مگر یاد رکھیں یہ بھی بڑی کائیاں ہوتی ہیں۔ گھر گھر کام کرنے اور بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطے نے اِن کو بھی بڑا تیز اور تجربہ کار بنا دیا ہوتا ہے۔ جس مالک سے نہیں بنتی، اُس کی ہر بات اور جملے کو مصالحے لگا کر مالکن کو ہنس ہنس کر بڑی رازداری سے بتاتی ہیں تاکہ وجہ نزع کے بیج کو زرخیزی ملتی رہے، اور وہ نیک اور پارسا کہلاتی رہے، اور مالکن کا شوہر مشکوک اور بدنیت ثابت ہوتا رہے۔ اِس عمل سے نوکرانی بہت سے نفسیاتی منافع حاصل کرتی رہتی ہے، جس کا اندازہ مالکن کو بھی نہیں ہوتا ـــــ ایک اہم بات یہ ہے کہ ہم جو لکھ رہے

ہیں وہ ہدایت نامہ برائے مالکن ہرگز نہیں ہے۔ بس جو معاشرے میں ہو رہا ہے، اُسی کی عکاسی ہے، جس کا بہت زیادہ مواد ہماری زوجہ نے ہمیں فراہم کیا ہے۔ بس صرف اس کو صفحہ قرطاس پر تحریر کرنے کا اعزاز ہم کو حاصل ہوا ہے — !

بعض ایسی نوکرانیاں بھی دیکھنے کو ملی ہیں کہ جنھوں نے مدتوں بلکہ مرتے دم تک گھروں میں کام کیا، اور اپنے مطلب سے مطلب رکھا۔ اُن کی عزت ماں جائی کی طرح ہوتی ہے، اور سر آنکھوں پر احترام و ادب سے بٹھائی جاتی ہیں۔

اَب رہ گئیں دُوسری قسم کی کُل وقتی ملازمائیں — اِن سے گھر اور خاندان کا کوئی معاملہ، کام، بات اور جھگڑا پوشیدہ نہیں ہوتا۔ وہ گھر کے ہر راز سے سب سے زیادہ باخبر ہوتی ہے۔ صاحب کیا کرتے ہیں، اُن کے کپڑوں پر کیسے اور ایسے داغ کس کس دن ملا کرتے ہیں — بیگم صاحبہ کو کس کا فون آتا ہے، وہ کیا خریدتی ہیں اور کس کو کتنے کا بتاتی ہے۔ غرض ہر بات اُس کے ناقص علم میں ہوتی ہے۔ جاسُوسی کے فرائض بھی عمدہ طریقے سے انجام دیتی ہیں، بات لگانے پر بھی قادر ہوتی ہیں۔ جو گھر میں زیادہ نوازتا ہے اُس کی زبان بولتی ہیں۔ ناراض ہو جائیں تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں، اُن کو منانا آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ وہ اِسی راز سے آشنا ہوتی ہیں کہ ایک کام چھوڑنے کی دھمکی سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ یہ لوگ میرے بغیر نہیں جی سکتے، اور میں اِن آسائشوں کے بغیر جی نہیں سکتی۔ آخر منت سماجت اور تھوڑی سی رقم سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے، اور وہ اپنا سامان یہ کہہ کر واپس رکھ دیتی ہے کہ مجھے تو اِن بچوں سے بڑا پیار ہے، میں صرف اِن کی خاطر رُک گئی ہوں — !

پہلے زمانے میں ایسی مخلص ملازمائیں ہوتی تھیں کہ شرافت میں اُن کا جواب وثانی ملنا مشکل ہوتا تھا۔ دُور رس نگاہ رکھتی تھیں، سگی ماں سے زیادہ بچوں اور گھر

والوں کا خیال رکھتی تھیں، ایسا عمدہ کھانا بناتی تھیں کہ سب لوگ اُنگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔ گھر کی ہر چیز میں قرینے اور نفاست کو سمو کر سجاتی تھیں، سارے گھر کے صاف ستھرے لباس کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا کہ بہو مالکن کو پتہ ہی نہیں ہوتا تھا اور وہ سب سنوار دیتی تھیں۔ گھر میں شادی، بیاہ اور موت پر ایسے سلیقے سے نظام سنبھالتیں کہ جیسے گھر کا سب سے ہمدرد اور مخلص فرد سنبھالتا ہے۔ کسی چیز پر نیت خراب نہ کرتی تھیں، پھر اُن کو اجازت مل جاتی تھی کہ وہ اپنے سے نیچے ملازمائیں رکھ لیں، جن پر وہ شیرنی کی سی نگاہ رکھتی تھیں۔ ہر خیر کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی تھیں؛ مثلاً عید تہوار، میلاد، فاتحہ کا انتظام نہایت پاکیزگی اور نفاست سے ترتیب دیتی تھیں۔ بچے ماں سے زیادہ اُن سے فرمائش کرتے تھے، اُن کا حد سے زیادہ احترام کرتے اور اُن کی کہی ہر بات خوشی خوشی مان لیتے تھے۔ ایسی نایاب اور پاکیزہ فطرت اور خصوصیات سے آراستہ ہوتی تھیں کہ اُن کا احترام اور عزت واجب ترین شمار ہوتی تھی۔ ایسی انائیں اَب کہاں ملتی ہیں، نہ ویسی بیگمات اور خاندانی گھرانے رہے، اور نہ ایسی مامائیں رہیں، اور اگر کہیں کسی خوش نصیب گھرانے کو میسّر ہیں تو پورے خاندان پر اللہ کا دُوسرا شکر واجب ہے۔ ایسی صابر و شاکر خاتون ہوتی تھیں کہ اُن کا ذکر ہر بڑا چھوٹا نہایت ادب اور احترام سے کرتا تھا۔ اُن کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور شفقت کی تہذیب کا گہوارہ ہوتی تھی، گھر کے بچوں کو ایسے پالتی تھیں کہ اُن بچوں کا چلن اور کردار بے مثال ہو جاتا تھا، کوئی اُن کو مجال ہے کہ نوکرانی کہے، بس ماں جائی کہا جاتا تھا اور سب دل و جان سے کہتے تھے۔

مگر زمانہ بدلتے اور ہوا بدلتے دیر لگتی ہے۔ آج کل تو کمال ہی کمال ہے۔ سب ان اناؤں کا الٹ ہے، اس لئے کہ جو ملازمائیں آتی ہیں، غیر تہذیب یافتہ

گھرانوں سے آتی ہیں، اُن کے اپنی بچپن کی تربیت جس وحشی اور بدذات ماحول میں ہوئی ہوتی ہے، وہ لاشعوری طور پر گھر کے بچوں میں اُسی شعور کا عکس اُتارتی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ بچے سنورنے کی بجائے بگڑتے ہیں۔ گویا جیسی رُوح ویسے فرشتے۔ نیچ ذات سے کیا اُمید ہو سکتی ہے، جو اُس کے خون میں ہے، اُس کو تو بدلا نہیں جا سکتا۔ خیر ایسی آیاؤں کی گود میں پرورش پانے والوں سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچئے اور اندازہ کیجئے ___ اس لئے یہ ایسی ایسی شاطر ہیں کہ بیگم نہ بھی بنیں، مگر چھوٹی بیگم سے کم نہیں ہوتیں۔ بس بڑی بیگم اور اُن میں فقط اور فقط نکاح کے صیغے کی کمی ہوتی ہے، باقی سب وہی ہوتا ہے۔

عقل کے ساتھ دُوررسی جن لوگوں میں ہوتی ہے، کہتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ کامیاب اور اطمینان بخش زندگی گزارتے ہیں۔ اور اگر اِس کے ساتھ چال چلنے کا گُر اور سلیقہ بھی آتا ہو تو سونے پر سُہاگہ ہوتا ہے۔ ایک محترمہ جب چوبیس سال کی ہوئیں تو ایک رات اُنہیں خیال آیا کہ اگر ایک ایسی نوکرانی رکھی جائے کہ جو اُن کی دستِ نگر اور محتاج ہو تو زندگی گزارنے کا لُطف ہی آ جائے گا۔ اُنہوں نے وہ پوری رات جاگ کر یہ سوچتے گزاری کے اِس عمل کو اگر اگلے بیس سال میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے تو پوری حیات سکھ کے ساتھ گزاری جا سکتی ہے۔ جب عالمِ تصوّر میں سارے افسانے کا پلاٹ اور کردار اور حالات کا تانا بانا بُن لیا تو اُن کو سُکھ چین کی نیند آئی، حالانکہ فجر بھی آ کر گزر گئی تھی ___ !

اگلی دوپہر وہ فریش فریش سو کر اُٹھیں۔ بھاری بھرکم ناشتہ بطور کھانا دوپہر تناول فرمایا، اور ہر طرف گھوڑے دوڑائے کہ کوئی دس بارہ سال کی مفلوک الحال خاندان کی لڑکی مل جائے کہ جس خاندان کا اگلے پچاس برس کا نصیبہ بھی نوکر اور نوکرانی

کا ہو، اِس کے لئے اُنہوں نے کسی نجومی سے ہرگز زائچہ نہیں نکلوایا بلکہ اپنی دُورس بصیرت سے یہ قیافہ فرمایا۔ یعنی ایسا گھرانہ جس میں غربت، افلاس اور جہالت عروج پر ہو۔ جس میں کسی کے پڑھ لکھ کر بابو بننے کا صدیوں تک کوئی امکان نہ ہو ـــ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک غریب اور نادار گھرانے تک رسائی ہوگئی اور وہ اپنی چھ بیٹیوں میں سے ایک دس سالہ مریل سی گنجی لڑکی کو اِس نوکری پر رکھوانے پر آمادہ ہو گئے۔ گویا بلّی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ لڑکی بھی اچھے گھرانے میں ٹھکانے لگ گئی اور ماہانہ مال متاع کی بھی وافر اُمید پیدا ہوگئی ـــ مالکن صاحب نے پہلے دن سے ہی اِس جنگلی اور آوارہ بلّی کی گرومنگ شروع کر دی۔ کچھ ہی دنوں میں پنجے مارنے والی آوارہ بلّی تہذیب سے آشنا ہو کر شائستگی پر آ گئی ـــ بارہا ایسا وقت بھی آیا کہ اُس کے ماں باپ آجاتے اور اُس کو سمجھدار اور شائستہ دیکھ کر سکتے میں چلے جاتے۔ جب اُن کو ہوش آتا تو فوراً مالکن کو دھمکی سے نوازتے کہ اَب ''کڑی'' کافی بڑی اور جوان ہوگئی ہے: اَب یہ کام نہیں کرے گی، ہمیں تو دن رات اِس کی اور اِس کی جوانی کی فکر کھائی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا اصل میں کچھ بھی نہ تھا۔ مالکن سمجھدار اور نبض شناس تھی، ہر بار اِس مطالبے پر سو دو سو روپے تنخواہ بڑھا دیتی جو وہ پوری کی پوری لے جاتے، اور ساتھ میں کچھ پرانے استعمال شدہ کپڑے اور تھوڑا سا دانہ گندم جنگلی بلّی کے والدین کے ہمراہ کر دیتی کہ اُن کا منہ پھر کچھ ماہ کیلئے بند ہو جائے، کہ اُسی دانہ گندم نے آدم وحوا کو جنت سے بے لباس نکلوایا تھا۔ اِس کے بعد وہ اُسے مزید چند ماہ اور وہاں رکھنے پر آمادہ ہو جاتے، اور پھر جب یہ مال اور دانۂ گندم ختم ہو جاتا تو پھر یہی وظیفہ دوہرانے آ پہنچتے۔

مالکن خاموشی سے حالات کا جائزہ لے رہی تھی، اور سوچتی تھی کہ تا حیات پالیسی اِن حالات میں تو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی، آخر اِس کا حل تدارک،

مستقل بنیادوں پر کیسے کیا جائے ــــ آخر ایک دن مالکن کو نروان حاصل ہو گیا۔ وہ نروان یہ تھا کہ اگر اِس لونڈیا کو زندگی کی زبردست آسائشوں کا عادی بنا دیا جائے تو سو فیصد امکان ہے کہ اگر یہ ماں باپ کے ساتھ چلی بھی گئی تو اُن کے ساتھ ایک مچھروں بھری کوٹھری میں کبھی نہ رہ سکے گی، اور خود ہی معافی تلافی کے ساتھ، پیروں میں گر کر واپس اِسی سنگھاسن پر آ جائے گی، اور باقی زندگی صرف اور صرف یہیں تپسیا کر کے گزارے گی ــــ نروان کی یہ منزل پاتے ہی مالکن نے اپنی "نوکر ــــ رانی" پر آسائشوں کے تمام بند دروازے کھول دیئے۔

مالکن جہاں سے خود سُوٹ خریدتی، اُسی دُوکان سے اُس کو سُوٹ خرید کر دیتی، خود چُوڑیاں لیتی تو اُسی دُوکان سے اُس کو بھی دلواتی؛ جو خود کھاتی، اُس سے اچھا اور تازہ اُسے کھلاتی؛ اے سی والی گاڑی کار میں اُسے ڈرائیور کے ساتھ بٹھاتی تاکہ سرد اور تازہ ہوا اُس کو زیادہ لگے، اور اُس کا چھوٹا سا دماغ اور پھول کر کپا ہو جائے؛ جس کسی کے گھر جاتی، رانی کو ساتھ صوفے پر بٹھا کر ٹھونس ٹھونس کر تر مال کھلاتی، اور دلیل انسانی ہمدردی کے حلوے میں لپیٹ کر یہ دیتی کہ آخر یہ بھی تو انسان ہیں، کیا اِن غریبوں کا دل نہیں ہوتا ــــ اِس عملِ جہاں دانی سے نوکرانی کا دماغ آہستہ آہستہ عرش معلی پر آ گیا ــــ یہی تو دُور مقصود تھا ــــ پھر مالکن کی شادی کی خبر چلی تو شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مالکن روز "نوکر ــــ رانی" سے ایک نیا وعدہ، محبت کا لیتی اور اُس کے وعدہ دینے پر نئی نئی چیزوں سے اُس کو نہال کر دیتی کہ جو وہ نیچ ذات کی جنگلی بِلی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ چونکہ مالکن لائف ٹائم نوکر پالیسی پر گامزن تھی، سو ہر چال ٹھک کر کے صحیح بیٹھتی جاتی تھی۔ وہ روز رات کو اُس کو خرید کر دی گئی چیزیں دُوبارہ سے اُسے دکھاتی، گنواتی، دام بتاتی اور یہ یاد دلواتی کہ میں تو چند دن میں اگلے گھر

جا رہی ہوں، بس تو کل ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ دیہات چلی جا، اُنہیں تیرے بیاہ کی بڑی فکر ہے۔ پھر اُسے باور کراتی کہ اُنہوں نے تیرا رشتہ بڑی اچھی جگہ ڈھونڈا ہے، لڑکا ٹرالی میں مٹی ڈھوتا ہے، تیرا گزارہ تو ہو ہی جائے گا ــــ نوکرانی کے چہرے اور ماتھے پر جُوں جُوں ٹھنڈے پسینے کے قطرے اور سوچ کی گہری کالی لکیریں اُبھرتیں، وہ اور کاری ضربیں، رکھ رکھ کر اُس کے دماغ اور دل پر لگاتی ــــ وہ نوکرانی سے کہتی، پر دیکھ نا کتنی گرمی ہے، میں نے تجھے پھولوں کی طرح رکھا، تو اے سی میں نہ سوئے تو مجھے تیرے غم میں نیند نہیں آتی، تو صبح سلائس اور آملیٹ کے ساتھ ناشتہ نہ کرے تو دن بھر مجھے بھوک نہیں لگتی، تیرا لباس اور پرفیوم اچھا نہ ہو تو مجھے بے چینی رہتی ہے۔ بتا، وہ تجھے یہ سب دے سکے گا ــــ میں تو یہ سوچ کر ہی مَر جاتی ہوں ــــ جب وہ اِس طرح چنگاری کو پھونک مار کر شعلہ بناتی تو نوکرانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بے بسی کے آنسو گرنے لگتے۔ وہ مالکن کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگتی، تب مالکن اُسے اپنے گلے لگا کر پیار کرتی، اور وہ ہچکی باندھ کر روتے ہوئے کہتی ــــ باجی میں نہ جاؤں گی ــــ میں نہ جاؤں گی۔ بس جہاں تم شادی ہو کر جاؤ گی، میں بس وہیں جاؤں گی، تمہاری اور بھائی جان کی دن رات خدمت کروں گی، تمہارے قدموں میں ہی مَر جاؤں گی، پر کہیں نہ جاؤں گی۔

ایسا ہی ہوا ــــ وہ مالکن کے ساتھ بیاہ کر پہلی ہی رات ہمراہ آئی۔ مالکن حجلۂ عروسی میں شبِ زفاف میں مصروف ہو گئیں اور ''نوکر ــــ رانی'' حجلۂ عروسی کے دروازے کے عین باہر زمین پر بستر ڈال کر پڑ رہی ــــ چند دن ہی گزرے تھے کہ مالکن کی بھائی جان کے ساتھ کسی بات پر کھٹ پٹ ہو گئی۔ مالکن کو چالبازی کی سب خاموش ترکیبیں آتی تھیں۔ اُس دن سردی بہت تھی، مالکن نے میاں سے کہا،

آج سردی بہت ہے، رانی کو بھی اندر ہی سُلا لیں، آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ یوں ’’نوکر ـــ رانی‘‘ کا بستر بھی فرش پر بھائی جان کے برابر انسانی ہمدردی میں مستقل بنیادوں پر بچھ گیا۔ پھر سردیاں ختم ہوئیں تو گرمیاں آ گئیں مگر مالکن کا انتقام بھائی جان سے تکمیل کو نہ پہنچا۔ کمرے میں اے سی چل پڑا، پھر انسانی ہمدردی نے ہاتھ پیر کھول کر انتقام کی انگڑائی لی، اور ’’نوکر ـــ رانی‘‘ پوری گرمی کے لئے انسانی بھلائی کی بنیادوں پر اے سی والے ٹھنڈے کمرے میں زمین پر ایک طرف کو پڑ گئی۔ اَب سوچئے کہ یہ بیوی کا انتقام ہے یا انسانی ہمدردی کی بے لوث محبت ہے ـــ ؟

ہم اِس کارِ انسانیت پر مزید کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے ـــ سوائے اِس کے کہ اِن حالات میں اگر شوہر دُوسری بیوی لا کر الگ محفوظ گھر میں رکھنے کے بارے میں سوچنے لگے تو کوئی بُرائی تو نہیں ہے ـــ ! ـــ ویسے بھی لائف پالیسی پر بلاوجہ بحث کی اجازت نہیں ہوتی ـــ !

اور ہاں ـــ اگر باقی داستان احاطۂ تحریر میں لائی گئی تو قوی احتمال ہے کہ یہ انشائیہ، افسانے میں تبدیل ہو جائے گا؛ سو واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

نوکرانی کی داستان کی خوبی ہے کہ وہ برتن مانجھنے سے شروع ہو کر پورے معاشرے پر پھیل جانے کی عظیم الشان صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک صاحب خانہ خاتون نے تو جل کر یہاں تک کہہ دیا کہ یہ ناگن نہیں کالا بچھو ہوتی ہے، جس کا کاٹا تڑپ تڑپ کر پانی مانگتا ہے، مگر جلن کو اُس وقت آرام آتا ہے، کہ جب اِس بچھونی کو جُوتے سے نہ مار دیا جائے۔ ایک اور خاتون نے کہا کہ نوکرانی زہر کی بند پُڑیا ہوتی ہے، بس اِس کی اتنی حفاظت کریں کہ یہ زہر کی پُڑیا کھلنے نہ پائے۔ ایک محترمہ نے کہا

کہ یہ تو کالے علم کی پوٹ ہوتی ہے، اِس کو کبھی وار کرنے کا موقع نہ دیں، ورنہ یہ بخشے گی نہیں ـــــ !

اُدھر محلّے کی عورتیں بھی نوکرانیوں کے دماغ بگاڑنے اور خراب کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ اگر کسی محلّے والے سے ناراضگی ہو جائے تو اُس کی نوکرانی کو بلا کر ایسی نوٹوں کی گولی دیتی ہیں کہ اُن کے ہاتھوں بگاڑی نوکرانی کسی کے کام کی نہیں رہتی۔ ہمارے پڑوس میں ایک "منجھی پیڑھی" ٹھوکنے والے کی بیٹی بعض نا قابلِ بیان ذرائع سے نو دولتی امیر ہو کر آئی تو اُس نے آتے ہی اپنے مخالفین کی نوکرانیوں کے دماغ عرشِ معلّی پر پہنچا کے اہلِ محلّہ سے انتقام لیا، اور خود رفو چکر ہو گئی۔ جھوٹ بولنا، اِس گھر کی اُس گھر میں لگائی بُجھائی کوئی نوکرانی سے سیکھے۔ جس کو چاہے بدنام کر دیں، اور جس کو چاہیں نیک نام کر دیں، یہ اُن کے بائیں ہاتھ کا روزمرہ کا کھیل ہوتا ہے۔ کوئی منت اور مجبوری سے بلائے تو فوراً سر پر چڑھ جاتی ہیں۔ ریٹ بڑھانے کا اوّل اور کامل اصول اُن کے پاس یہ ہے کہ ہمارے پاس تو ٹائم نہیں ہے، حالانکہ کمبخت سارا دن دروازے سے جھانکتی ہے۔ نیچ ذات کی جو ہوتی ہے، اپنی ذات نہ دکھائے تو اور کیا دکھائے ـــــ !

آغا سلمان باقر

۲۶ جنوری ۱۹۵۶ء، لاہور

ڈاکٹر آف میڈیسن ان ہومیو پیتھک سائنسز، یو کے

خانوادہ آغا سلمان باقر

- ☆ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے پڑپوتے
- ☆ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کے بیٹے
- ☆ آغا محمد طاہر اور آغا محمد اشرف کے بھتیجے

تنقید اور تحقیقِ ادب

- ☆ مولانا محمد حسین آزاد — جلد اول
- ☆ مولانا محمد حسین آزاد — جلد دوم (زیرِ طبع)
- ☆ مولانا محمد حسین آزاد — جلد سوم (زیرِ طبع)
- ☆ محمد حسین آزاد، حیات شخصیت اور فن
- ☆ محمد حسین آزاد کا عالمِ وارفتگی
- ☆ تنازع دربار اکبری
- ☆ حکایات آزاد
- ☆ سیر ایران، تحقیق اور تجزیہ
- ☆ اشاریہ مخطوطات عالمِ وارفتگی، مولانا آزاد
- ☆ شگفتہ سلام
- ☆ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا محمد باقر کے سلام (تحقیق اور تجزیہ)
- ☆ شہزادہ ابراہیم (تحقیق اور تجزیہ)

مرتبہ و مقدمہ کتب

- ☆ ۴۰ سے زائد ادبی کتب جن کے آغا سلمان باقر نے مقدمات لکھے — بے شمار کتب کے فلیپ اور ابتدائیے تحریر کئے۔ لاتعداد ادبی کتب آغا سلمان باقر کی مرتبہ ہیں۔

سفرنامے

- ☆ صحرا میں وحشت
- ☆ ڈھاکہ کیک سوات
- ☆ فیری میڈوز
- ☆ کشمیر فردوس بریں
- ☆ چولستان (زیرِ طبع)
- ☆ کیلاش کافرستان میں چلم جوشی (زیرِ طبع)
- ☆ ہنزہ (زیرِ طبع)

افسانے

- ☆ خزاں میں سایہ

انشائیہ

- ☆ سلمان باقر کے انشائیے

نظمیں / شاعری

- ☆ شبِ وحشت کے بعد
- ☆ مزید دو مجموعۂ نظم زیرِ طبع

ادبی تنقیدی جائزے

- ☆ پاکستانی کہانیوں کے افسانوں کا مطالعاتی اور تنقیدی جائزہ
- ☆ الہامی لفظوں کا مصور، شفیق فاروقی
- ☆ حضرت یونس علیہ السلام

تحقیقی مقالات آغا سلمان باقر

- ☆ ۳۰۰ سے زائد تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مقالات ملکی اور غیر ملکی ادبی جریدوں میں ۱۹۷۳ء سے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

آغا سلمان باقر پر تحقیقی مقالہ

- ☆ ڈاکٹر آغا سلمان باقر — شخصیت اور فن از ثمرہ ثمینہ مقالہ ایم۔ اے۔ ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء

Aab-e-Hayat Publications,
186-New Anarkali Lahore